صفر ۱۳۵۷ھ

جلد ۱۲ — عدد ۲

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸ آنے

صفحـــه خـــالی

ضمیمہ ترجمان القرآن

الجہاد فی الاسلام

مفت

ناظرین ترجمان القرآن میں سے جو اصحاب اس رسالہ کیلئے پورا سالانہ

چندہ دینے والے پانچ خریدار مہیا فرمائینگے۔ ان کی خدمت میں کتاب

الجہاد فی الاسلام کا ایک نسخہ بلا جلد مفت نذر کیا جائیگا۔

خاکسار

منیجر

([illegible])

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہُوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعدِ اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عہ ۱۰	عہ ۲۵	للعہ ۴۵	لتہ
نصفِ صفحہ	۶	عہ ۱۵	عہ ۲۵	للعہ ۴۵
ربع صفحہ	للعہ ۴	عہ ۱۰	عہ ۱۷	عہ ۲۵

۱۔ کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴۔ نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵۔ ٹائٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

فہرست مضامین

ماہ صفر ۵۷ھ مطابق اپریل ۳۸ء - جلد ۱۲ - عدد ۲

باہتمام چودھری نیاز علی خان صاحب پرنٹر و پبلشر گیلانی الکٹرک پریس لاہور میں طبع ہوکر دفتر ترجمان القرآن واقع دارالاسلام (نزد پٹھان کوٹ) سے شائع ہوا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

پچھلی صحبت میں ہم نے ہندوستانی سیاست کے جن مہمات مسائل کی طرف اشارات کیے تھے، سلسلۂ کلام کو آگے بڑھانے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین کے حافظہ میں ان اشارات کو پھر تازہ کر دیں۔

سب سے پہلے ہم نے یہ بتایا تھا کہ بیسویں صدی میں حکومت کا تصور، انیسویں صدی اور اس سے پہلے کے تصورات سے اصلاً مختلف ہو گیا ہے۔ قدیم تصور کے مطابق حکومت ایک خاص دائرے میں محدود رہتی تھی، اور باشندوں کے تمدنی، معاشی اور تعلیمی معاملات سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن جدید تصور کی رو سے وہ تمام پرانی حدیں ٹوٹ گئی ہیں، جو اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھتی تھیں۔ اب حکومت، زندگی کے ہر شعبے میں دخیل ہوتی ہے، اور اپنی فیصلہ کن طاقت سے پوری حیات اجتماعی کے نقشے کو بناتی اور بگاڑتی ہے۔ لہٰذا اس دور میں حکومت کے نظام، اسکی نوعیت اور اسکے اصول کا مسئلہ در اصل ایک قوم کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اگر کسی قوم پر ایسا نظام حکومت مسلط ہو جائے جو اسکے مزاج قومی اور اسکے اصول تہذیب و تمدن سے مناسبت نہ رکھتا ہو تو وہ قوم بحیثیت ایک قوم ہونے کے زندہ نہیں

رہ سکتی، کیونکہ نظام حکومت دیکھتے دیکھتے اسکی زندگی کا نقشہ بدل کر کچھ سے کچھ کر دیگا۔

اس کے بعد ہم نے یہ حقیقت ذہن نشین کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان میں اس وقت جس نظام حکومت کا نشوونما ہو رہا ہے، وہ دراصل اسی انگریزی حکومت کا ایک بچہ ہے، جو گذشتہ ڈیڑھ سو برس کی مدت میں ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کی صورت کو بہت کچھ بگاڑ چکی ہے۔ بظاہر نظام حکومت میں جو کچھ تغیر و تبدل ہو رہا ہے، وہ محض فروعی ہے ورنہ دراصل ڈھانچہ وہی کا وہی ہے جو انگریزوں نے بنا دیا ہے، اور صرف ڈھانچہ ہی نہیں، بلکہ اسکے بنیادی تصورات اور اسکے فکری اصول بھی وہی ہیں جن پر انگریزی سلطنت کی اساس قائم ہے۔

اس سلسلہ میں ہم نے خصوصیت کے ساتھ تین اہم ترین اصولوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو انگریزی نظریات سیاسی سے اخذ کر کے ہندوستان کے نظام حکومت میں پیوست کیے جا رہے ہیں، یعنی وطنی قومیت — ڈیماکریسی کا انگریزی ماڈل — حکومت کا پارٹی سسٹم۔ انگریز اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ حکومت کا کوئی ایسا نقشہ نہیں سوچ سکتا جو ان تین اصولوں سے خالی ہو۔ ہندو قوم اپنی اغراض کی خاطر مجبور ہے کہ ان اصولوں کی پرزور حمایت کرے، کیونکہ یہ اسکو ہندوستان کا مالک لاشریک لہا بنا سکتے ہیں، اور کوئی قوم فرشتہ نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہ کرے جو اسکے مفاد کی بہترین خدمت کرتی ہو۔ لیکن مسلمانوں کیلیے، اور ہندوستان کی دوسری قوموں کیلیے، جو اپنی مستقل حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں، اس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں ہو سکتی کہ وہ ان اصولوں کو قبول کریں، اور ان پر جدید نظام حکومت کے ارتقاء کو گوارا کرلیں، (اس میں خود مددگار بننا تو حماقت نہیں غداری ہے)۔ اسلیے کہ ان اصولوں پر جو حکومت قائم ہوگی اس میں ہندوستان کی ساری آبادی کیلیے تہذیب، تمدن اور معیشت و معاشرت کے نقشے بنانے اور

بگاڑنے کی پوری طاقت صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوگی، اور وہ خواہ کتنی ہی فیاضی و رواداری سے کام لیں، بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ قانون سازی، تنفیذ قانون، عدالت، اور تعلیم کا جو نظام بالکل ایکے زیر اثر ہوگا، اسکی کارگزاری، حد سے حد پچاس برس کے اندر مسلمانوں اور تمام دوسری قوموں کے امتیازی وجود کو فنا کردیگی۔

اسکے بعد ہم نے مذکورۂ بالا اصول ثلثہ پر فرداً فرداً بحث شروع کی تھی، اور سب سے پہلے ان فتنوں، کو بیان کیا تھا جو ہندستان کی پوری آبادی کو ایک قوم بنانیکی کوشش، بلکہ انکو ایک ہی قوم فرض کر لینے سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اس اصل خبیث کی چند ہی شاخوں کا ہم ذکر کرنے پائے تھے کہ قلت گنجائش کے سبب سے سلسلۂ بیان منقطع کر دینا پڑا۔ اب ہم آگے بڑھنے سے پہلے پھر اسی کی چند اور شاخوں کی طرف اشارہ کرینگے۔

وہ اسی قومیت کے مفروضہ کو حقیقت بنانیکی خواہش تھی جس نے پنڈت جواہر لال نہرو کو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلہ میں قادیانیت کی حمایت پر آمادہ کیا تھا، اور جسکی بدولت "قوم پرستوں" میں اس مت کی ہمت افزائی کا جذبہ روز افزوں ہے، حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ قادیانی گروہ انگریزی امپیریلزم کا بہت چہیتا بتنی ہے۔ بظاہر یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ "سامراج شکن" اور "ترقی پسند" حضرات کا ان "سامراج پرستوں" اور "رجعت پسندوں" سے کیا رشتہ؟ اور ایک پنڈت کو متکلم اسلام کی حیثیت اختیار کرنیکی کیا ضرورت؟ اور اس مسئلہ سے اسکو کیا دلچسپی کہ کونسا گروہ دائرۂ اسلام کے اندر ہے اور کونسا باہر؟ لیکن ذیل کا اقتباس پڑھکر آپکی حیرت، عبرت سے بدل جائیگی۔ ایک سے کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر شنکر داس نے اخبار "بندے ماترم" میں لکھا تھا۔

"ہندوستانی قوم پرستوں کو اگر کوئی امید کی شعاع دکھائی دیتی ہے تو وہ احمدیت

کی تحریک ہے - یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان جسقدر احمدیت کی طرف راغب ہونگے
اسی قدر قادیان کو مکہ تصور کرنے لگیں گے اور آخر کار قوم پرست بن جائینگے مسلمانوں
میں اگر کوئی تحریک عربی تہذیب اور پان اسلامزم کا خاتمہ کرسکتی ہے تو وہ یہی احمدی
تحریک ہے ...... جس طرح ایک ہندو کے مسلمان بن جانے پر اسکی شردھا اور
عقیدت رام، کرشن، وید، گیتا اور رامائن سے اٹھ کر حضرت محمد صاحب، قرآن مجید
اور عرب کی بھومی میں منتقل ہو جاتی ہے، اسی طرح جب کوئی مسلمان احمدی بن جاتا ہے
تو اس کا زاویۂ نگاہ بھی بدل جاتا ہے - حضرت محمدؐ میں اسکی عقیدت کم ہوتی چلی جاتی
ہے اور جہاں پہلے اسکی خلافت عرب میں تھی، اب وہ قادیان میں آجاتی ہے
...... ایک احمدی، خواہ دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہو، روحانی تشکی حاصل
کرنے کیلیے وہ اپنا منہ قادیان کی طرف کرتا ہے،،

یہ چند فقرے ،،قوم پرست،، کے ضمیر کو بالکل بے نقاب کردیتے ہیں - ان سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ،، جغرافی قومیت ،، کا مفاد، اسلام کے مفاد کی عین ضد واقع ہوا ہے - اسلام کا مفاد اس میں ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک عالمگیر مرکز سے وابستہ ہوں، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک قبلہ کے محور پر گھومیں - اسکے بالکل برعکس جغرافی قومیت کا مفاد یہ چاہتا ہے کہ ہر جغرافی خطہ کا مسلمان اس عالمگیر مرکز و محور سے اپنا تعلق منقطع کرکے، اپنے ہی وطن میں اپنی عقیدتوں کا مرکز پیدا کرے، یعنی مسلمان کے بجائے ،، قوم پرست ،، بن جائے - لہذا ہندوستان کا ،، قوم پرست ،، کم سے کم جو کچھ چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ملک کا مسلمان اگر ہردوار کی نہیں تو قادیان ہی کی جاترا کرے، رام و کرشن سے نہیں تو مرزائے قادیانی ہی سے عقیدت کا رشتہ جوڑے (جو پیش بینی کرکے پہلے ہی اپنے آپ کو کرشن جی کا اوتار قرار دے چکے ہیں) وید اور گیتا کو نہیں تو مرزا صاحب

ہی کے الہامات کو قرآن سے بدل لے ــــ یہی چیز ہے جس کی بنا پر ہم پیشگوئی کر سکتے ہیں کہ قادیانی گروہ انگریزی امپیریلزم کا جیسا چہیتا متبنّیٰ رہا ہے، عنقریب اس سے زیادہ چہیتا متبنّیٰ ہندوستانی قوم پرستی کا بن جائیگا۔

لیکن قوم پرستی کی تبلیغ کے نتائج اس سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں۔ وطنی قومیت کی طرف رجحان پیدا ہوتے ہی انسان کے زاویۂ نگاہ میں جو عظیم الشان تغیر واقع ہوجاتا ہے، اسکی نہایت بیّن مثالیں ہمکو اس لٹریچر میں ملتی ہیں جو آجکل مسلم نژاد ہندوستانی قوم پرستوں کے قلم سے نکل رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح ترکی قوم پرست، اسلامی روایات کو چھوڑ کر عہد جاہلیت کی ترکی روایات کی طرف رجوع کرنے لگا ہے، بالکل اسی طرح ہندوستانی قوم پرست بھی زمانۂ قبل اسلام کے ہندوستان سے روحانی تحریک (   ) حاصل کرتا ہے، اور اسلامی تہذیب کے نمائندوں کو چھوڑ کر ہندوستانی تہذیب کے نمائندوں کی طرف عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اب وہ ہندوستان کو خطاب کرکے یوں کہتا ہے:

دیویوں دیوتاؤں کا مسکن ہے تو — تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دینگے ہم

اب وہ قوم پرستی کے جذبہ سے سرشار ہوکر یہاں تک کہہ گزرتا ہے :۔

جل رہے تھے محفلوں میں جسکی ویدوں کے چراغ — ہوں اُجاگر جن سے بھارت کے سپوتوں کے دماغ
وہ کرشن اور اسکی بنسی کی صدائیں چار سو — گیان کی گیتا کہ ہو ہر آتما کو آرزو
خاکدان ہند سے گوتم اٹھا نانک اٹھا — صاحبِ عرفان تھا اک فرد اپنے وقت کا
ہند کی اس خاک سے کیا کیا رشی پیدا ہوئے — کیسے کیسے بھیم و ارجن سے جری پیدا ہوئے
کیا کہیں اُس عہدِ زرّیں کی حقیقت کیا کہیں — دہر میں مانی ہوئی تھی اپنی عظمت کیا کہیں

ہند کی راہوں میں اوروں کے قدم آئے نہ تھے ہاں ابھی اہلِ عرب اہلِ عجم آسئے نہ تھے

تک رہی تھیں دور سے اغیار کی نظریں اسے چاہتے تھے سب یہی تسخیر ہم کرلیں اسے

اس مضمون کی متعدد نظمیں رسالہ "ہمایوں" لاہور مورخہ فروری ۳۸ء میں شائع ہوئی ہیں اور سب کے مصنف مسلمان خاندانوں کی پیداوار ہیں۔ ایسی نظموں کی لَے اب برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

ہندوستانی قومیت اگر بنیگی تو یہ اس کا نقشہ ہوگا۔ لیکن اسکے بننے سے پہلے ہی ہمارے "قوم پرست" لیڈروں نے یہ فرض کرلیا ہے کہ وہ بن چکی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ کہہ رہے ہیں کہ کسی فرقہ کو اپنی علحدہ سیاسی تنظیم نہ کرنی چاہیے، کیونکہ جب وہ ایک ہی قوم کے "فرقے" ہیں تو انکی مستقل سیاسی تنظیم کے معنی "تفرقے" کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ گاندھی جی کے مقابلہ میں کوئی مسلمان، مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہی نہیں کرسکتا، کیونکہ گاندھی جی تو پوری "قوم" کے نمائندے ہیں۔ وہ جو کچھ فرمائیں، لامحالہ وہی "قوم" کے اس حصے کی آواز بھی ہوگی جو مسلمان کہلاتا ہے۔ اسکے خلاف اگر کوئی مسلمان کچھ کہے تو وہ قابلِ التفات نہیں۔ حال میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ایک ممتاز رکن ڈاکٹر پتابھی سیتارامیا صاحب نے فرمایا کہ:-

"یہ ایک مشتبہ امر ہے کہ آیا مسٹر جناح اسی طرح مسلمانوں کی طرف سے بولنے کے مجاز ہیں جس طرح مہاتما گاندھی پوری ہندوستانی قوم کی طرف سے بول سکتے ہیں۔ ...... کُل اپنے جزو پر آپ سے آپ مشتمل ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی کُل کے نمائندے ہیں، اسلیے وہی اس جزو کے مفاد کا بھی تحفظ کرتے ہیں جبکی

نمائندگی مسٹر جناح کر رہے ہیں" (ٹریبیون مورخہ یکم مئی ۱۹۳۸ء)

گویا یہ مفروضہ اب یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ کل میں مسلمان مدغم ہو گئے اور انکی کوئی علٰحدہ آواز باقی نہیں رہی۔ اب اگر کسی طرف سے کوئی علٰحدہ آواز آتی ہے تو وہ غول بیابانی کی آواز ہے یسلمان کل سے الگ ہے کہاں جو وہ بولے گا!

اسی مفروضہ کی بنا پر ایک جماعت نے اپنے آپ کو "قوم" کا اجارہ دار قرار دے لیا ہے۔ جو بات وہ چاہیں طے کر لیں، وہی گویا "پوری قوم" کی آواز ہے۔ اگر تمام مسلمان ملکر بھی اسکی مخالفت کریں، تب بھی اسکی بات اپنی جگہ "قومی" ہی رہتی ہے۔ اسکی نہایت روشن مثال نہرو رپورٹ ہے جسے مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیت العلمار، غرض مسلمانوں کی تمام جماعتوں نے بالاتفاق رد کر دیا تھا، مگر پھر بھی اسکی حیثیت ایک "قومی مطالبہ" ہی کی رہی اور اسے یہی کہکر برٹش گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا کہ اس "قومی مطالبہ" کو ایک سال کے اندر منظور کرو ورنہ ہم لڑینگے۔

نہرو رپورٹ دریائے راوی میں غرق ہو گئی، مگر وہ مفروضہ جس پر اسکی بنا رکھی گئی تھی اپنی جگہ بدستور قائم ہے۔ چنانچہ مسٹر سوباش چندر بوس ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں کہ:

"ہم ہر اس تصفیہ کو قبول کرینگے جو اصولِ قومیت سے مطابقت رکھتا ہو"

اس ارشاد کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ راشٹرپتی جی نے صرف پہلا قضیہ بیان فرمایا ہے یعنی یہ کہ کوئی تصفیہ اس وقت تک قابلِ قبول نہیں جب تک کہ مسلمان اپنی مستقل قومیت سے دست بردار ہو کر ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو گم نہ کر دیں۔ اسکے بعد دوسرا قضیہ جو منطقی طور پر پہلے قضیہ سے خود بخود پیدا ہوتا ہے، انہوں نے حذف فرما دیا، یعنی یہ کہ جب مسلمان

خود ہی "قوم" میں اپنا گم ہو جانا قبول کر لینگے تو تصفیہ کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہیگا، کیونکہ "قوم" سے الگ انکا وجود ہوگا کہاں کہ وہ کچھ بولیں اور ان سے کسی امر کا تصفیہ کیا جائے۔ قوم خود قوم سے کب تصفیہ کیا کرتی ہے؟ اور اگر بالفرض ان کے کچھ شوریدہ سر افراد نے بولنے پر اصرار ہی کیا تو "قوم" کے اجارہ دار جس بات کو نہ ماننا چاہینگے اسکے متعلق انہی کی زبان سے "قوم" کہدیگی کہ میں ——— اور اس "میں" میں مسلمان بھی بالتبع شامل ہونگے ——— اس بات کو نہیں مانتی!

اسی مفروضہ کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ جداگانہ انتخاب منافی قومیت ہے، اور سرکاری ملازمتوں میں تناسب کا سوال بھی قومیت کے خلاف ہے، اسلیے کہ جب ایک ہی قوم ہندوستان میں رہتی ہے تو الگ الگ انتخاب کے کیا معنی، اور ملازمتوں میں یا اسٹیٹ کے دوسرے ذمہ دارانہ مناصب میں متناسب تقسیم کا کیا سوال؟ ساری قوم کے مسائل ایک ہی سے ہیں۔ ان کا تصفیہ اگر ہندوؤں نے کر دیا تو کیا اور مسلمانوں نے کر دیا (جس کا امکان دو چھوٹے چھوٹے صوبوں کے سوا اور کہیں نہیں ہے) تو کیا۔ سرکاری محکمے اور "قوم" کی پوری زندگی کو متاثر کر دینے والے مناصب اگر سب کے سب ہندوؤں سے بھر گئے تب بھی کوئی نقصان تو نہ ہوا، آخر "قوم" ہی میں تو رہے۔ اور اگر دبفرض محال بلکہ اس ضروری شرط کے ساتھ کہ ایسا ہونا محال ہو) مسلمانوں سے لبریز ہو گئے تو بھی بہرحال قوم سے باہر نہ گئے۔

یہ مفروضہ درحقیقت ایک دو دھاری تلوار ہے۔ اگر حقیقت میں یہ مفروضہ کے بجائے امر واقعی بن جائے، تب تو اسکے معنی ہندوستان کی سرزمین سے اسلام کے کلی استیصال کے ہیں۔ لیکن جب تک یہ امر واقعی نہیں بنتا، اس وقت تک یہ مسلمانوں کو ہر ممکن طریقے سے دبانے اور کچلنے، اور ان کو

قوت اور منفعت کی ہر جگہ سے محروم کر دینے، اور انکی تہذیب و تمدن کو رفتہ رفتہ مٹانے کیلئے ایک بے پناہ ہتھیار ہے، تاکہ آخر کار ان کیلیے دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کیے بغیر چارہ نہ رہے: یا تو وہ اپنے آپ کو "قوم" میں اس طرح تحلیل کر دیں کہ اسلام کا کوئی امتیازی نشان، حتیٰ کہ نام تک ان کے ساتھ لگا نہ رہے۔ یا پھر شودر بن کر رہیں۔

ہمارے اس بیان کو مبالغہ نہ سمجھیے۔ ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عملی زندگی میں امتیاز کا تو یہ حال ہے کہ ہر جگہ ہندو کی نظر ہندو پر اور مسلمان کی نظر مسلمان ہی پر پڑتی ہے، خواہ انتخاب کا معاملہ ہو، یا ملازمت کا، یا لین دین کا۔ اور دوسری طرف ہندو قوم جو کثیر التعداد بھی ہے، اور انگریزی سلطنت کی مشفقانہ عنایات سے ڈیڑھ سو برس کے مسلسل ترجیحی سلوک کی بدولت زندگی کے ہر شعبے پر پہلے ہی سے قابض ہو چکی ہے، نہایت معصومانہ ہوشیاری کے ساتھ ہم سے یہ کہتی ہے کہ آؤ اس ہمہ گیر امتیاز کو غیر موجود فرض کر کے ہم اور تم ایک قوم بن جائیں اور تم اسٹیٹ میں اپنے الگ حصہ کا مطالبہ چھوڑ دو۔ اس بات کو اگر مان لیا جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ عملاً تو امتیاز قائم رہیگا مگر اسکو روکنے والی کوئی طاقت موجود نہ رہیگی بلکہ مزاحمت کو منافی قومیت قرار دے کر دبا دیا جائیگا۔ رفتہ رفتہ اسٹیٹ کے اقتدار سے مسلمان بے دخل کر دیئے جائینگے، اور زیادہ سے زیادہ پچاس سال میں نوبت اُسی حد تک پہنچ جائیگی جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ ہندوستان کی پوری آبادی میں ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک اور جہلاء سے لیکر بہترین تہذیب یافتہ لوگوں تک یکساں پھیلی ہوئی ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی جیسے بلند ترین تہذیبی ادارے میں بھی امتیاز کا یہ حال ہے کہ سنیٹ کے ۱۰۰ ممبروں میں سے صرف ۱۲ مسلمان ہیں، سنڈیکیٹ کے ستر۱۷ ارکان میں صرف ایک مسلمان بار پا سکا ہے

۸۰ سال کی طویل مدت میں صرف ایک مسلمان کو وائس چانسلری کا عہدہ مل سکا ہے، دفتری اسٹاف کے ۱۸۰ ممبروں میں صرف دو مسلمان ہیں اور تعلیمی اسٹاف کے ۸۰ ارکان میں بھی مسلمان دو سے زیادہ نہیں ہیں آج شاید کوئی انتہا درجہ کا ہٹ دھرم آدمی بھی اسکی یہ توجیہ نہ کرسکے گا کہ لائق مسلمان ملتے ہی نہیں۔ اسکی وجہ بجز قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کے اور کچھ نہیں بتائی جاسکتی۔ اور اسکے ساتھ ہمسایہ قوم کے جذبات بلکہ اسکی عزت تک سے انتہائی سنگدلانہ بے پروائی کا یہ حال ہے کہ بی۔ اے کے نصاب میں بنگالی زبان کا ایک ناول (دیوی چودھرانی) پڑھایا جاتا ہے جس میں مسلمانوں کو کھلے کھلے الفاظ میں چور، بدمعاش کمینہ اور بزدل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن ان روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ادارہ ہے، جو ملک کے آئندہ لیڈر بننے والے ہیں۔ اس ادارہ میں بھی جب عہدہ داروں کے انتخاب کا سوال آیا تو ہندو اکثریت کی نظر ہر عہدے کیلیے ہندو ہی پر پڑی۔ چنانچہ ۳۶ء میں ایک بھی مسلمان انکو اس قابل نہ ملا جو کسی عہدے کیلیے منتخب کیا جاتا۔ بعد میں بعض مسلمانوں کو بھی موقع دیا گیا، مگر وہ صرف ایسے مسلمان تھے جن کے نامسلمان ہونیکا پوری طرح اطمینان کرلیا گیا تھا ـــــ زیادہ سے زیادہ وسعت قلب جس کا اظہار کیا جاسکتا ہے وہ بس اتنی ہی ہے کہ ہندو بعد نظر انتخاب کسی ایسے "مسلمان" پر جاکر ٹھیر جائے جو اعمال، خیالات، جذبات، غرض کسی حیثیت سے بھی مسلمان نہ پایا جاتا ہو ـــ اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر کسی ادارے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو تو وہاں بھی ایسا ہی ہوگا۔ اس لیے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں۔ انکے درمیان قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ کوئی باہر سے لگی ہوئی چھوت نہیں ہے، بلکہ اندر سے ابھرنے والا جذبہ ہے جو اس وقت تک فنا نہیں ہوسکتا جب تک ہندو، ہندو کی حیثیت سے اور مسلمان، مسلمان کی حیثیت سے فنا نہ ہو جائے۔ قیاس نہیں بلکہ واقعات سے ثابت ہے کہ یہی صورت حال ہر اس انتخاب

عام میں پیش آئی ہے، جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر ووٹ دیا ہے۔ ایسے انتخاب میں لازمی طور پر ہندوؤں کی ۹۹ فیصدی تعداد کو اپنی نمائندگی کے قابل صرف ہندو، اور مسلمانوں کی ۹۹ فیصدی تعداد کو اپنی نمائندگی کے قابل صرف مسلمان ہی نظر آتا ہے۔ منٹو مارلے ریفارم سے پہلے جب کہ انتخابات مخلوط تھے، کبھی کوئی مسلمان کسی حلقے سے کامیاب نہ ہو سکا، اور حکومت کو ہمیشہ نامزدگی کے طریقے سے مسلمانوں کی نمائندگی کا انتظام کرنا پڑا۔ اِس نیشنلزم کے دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اجمیر کے مخلوط حلقۂ انتخاب سے تو آج تک کوئی مسلمان اسمبلی میں گیا ہی نہیں، رہی دہلی، سو وہاں ہندو تو مہا سبھائی ٹائپ کے بھی کامیاب ہو سکتے ہیں، مگر مسلمان صرف آصف علی ٹائپ ہی کا کامیاب ہوتا ہے، اور وہ بھی ایک مرتبہ کی سخت ناکامی کے بعد۔

خود وہ جماعت جو "متحدہ قومیت" کی علمبردار بنی ہوئی ہے، اسکی جڑوں میں بھی یہی قومی امتیاز اور یہی ترجیح ہم جنس، آخری ریشے تک اتری ہوئی ہے۔ گئو رکھشا، ہندی اور اچھوت ادھار پر جان چھڑکنے والا گاندھی تو کانگریس کا مختارِ کل بن سکتا ہے، مگر مسلمانوں کے مفاد کا نام لینے والا محمد علی (علیہ الرحمہ) کانگریس کے دائرے میں بھی نہیں ٹھیر سکتا۔ سخت مہا سبھائی ٹائپ کا ہندو بھی کانگریس میں ممتاز عہدوں پر فائز ہو سکتا ہے مگر مسلمان کیلیے وہاں ذمہ داری کے عہدوں پر پہنچنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ یا تو وہ ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر خان، ڈاکٹر اشرف، اور رفیع احمد قدوائی کے ٹائپ کا ہو، یا پھر صبر و استقامت کے اس مرتبہ پر فائز ہو جس پر آجکل جناب مولانا ابوالکلام آزاد فائز ہیں، یعنی کانگریس ورکنگ کمیٹی کی رکنیت سے مشرف ہونیکے لیے وہ مسلمانوں کے مفاد کا نام تک زبان پر نہ لائے، اور ورکنگ کمیٹی میں وہی حیثیت قبول کرے جو وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں ہندوستانی ممبروں کی حیثیت ہے[1] ــــــ اس کی وجہ قومی امتیاز کے

[1] بلاشبہ ایک مسلمان کیلیے صبر و ثبات کا یہ مقام، امام (۱۲) احمد ابن حنبل اور گیلیلیو کے مقام صبر و ثبات سے بھی زیادہ اشد

سوا اور کیا ہے؟ اس کا الزام تو برطانوی سامراج کے سر تھوپنے کی جرأت شائد پنڈت جواہر لال نہرو بھی نہیں کر سکتے۔

پھر اگر یہ قومی امتیاز کا نہیں تو اور کس چیز کا کرشمہ ہے کہ ہری پورہ کانگریس کے موقع پر مسلمانوں کو ڈیلی گیٹ منتخب کرنے کیلیے پنڈت جواہر لال کو کانگریس کمیٹیوں کے نام ایک سفارشی گشتی (Circular.) بھیجنے کی ضرورت پیش آئی، اور پھر بھی بکثرت مقامات پر ہندو امیدواروں کے مقابلہ میں مسلمان امیدوار صرف اسلیے کامیاب ہو سکے کہ ہندوؤں کی نظر انتخاب ــــ ایسے موقع پر بھی جبکہ مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی شدید ضرورت تھی، اور صدر کانگریس اس ضرورت کی طرف توجہ بھی دلا چکا تھا ــــ ہندوؤں ہی پر جا کر ٹھیرتی تھی۔ اور یہ قومی امتیاز نہیں تو اور کیا ہے کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں نام نہاد مسلمانوں کے گروہ سے بھی کوئی وزیرِ اعظم نہ بن سکا، اور ایسے مسلمان کو وزارتِ عظمٰی کا منصب صرف اس صوبہ میں حاصل ہوا جہاں مسلم اکثریت ہے۔ اسیطرح ہندو اکثریت کے صوبوں میں سکے قوم پرست مسلمانوں کو بھی اسمبلی کی صدارت نہ مل سکی۔ اور وزارتوں اور پارلیمنٹری سکرٹریوں میں بھی آبادی کے اسی تناسب کو ملحوظ رکھا گیا جو کہا جاتا ہے کہ صرف "فرقہ پرست" ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور حتی الامکان کوشش کی گئی کہ اہم ترین شعبے کسی نام نہاد مسلمان تک کے اختیار میں نہ جانے پائیں۔ اور یہ قومی امتیاز نہیں تو اور کیا ہے کہ یو۔پی اور بہار میں کسانوں کے جن حقوق کی پر زور حمایت کی جاتی ہے، بنگال میں انہی حقوق کے خلاف کھلی اور چھپی ہر قسم کی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں، حتیٰ کہ بنگال کانگریس کمیٹی کا سرکاری آرگن (Advance.)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۲۔ ہے، اگرچہ ارفع نہیں۔ اسلیے کہ وہاں جسمانی مصیبت کے ساتھ کم از کم ضمیر کا اطمینان تو تھا، اور یہاں بر بنائے حسن ظن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ بھی میسر نہیں۔ اسی بنا پر جناب مولانا نے گذشتہ عید اضحٰی کے خطبہ میں اپنے اس صبر و ثبات پر فخر فرمایا۔ گو یہ چیز اس شخص کیلیے قابل فخر نہیں جو کبھی ابن تیمیہ اور اسماعیل شہید کے منصب کا امیدوار تھا۔

صاف لکھ دیتا ہے کہ:

"زمینداروں کی اکثریت ہندو ہے اور کسانوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ بنگال کے قانون کاشتکاران کا مسودہ، ہمیں خوف ہے کہ اس صوبہ میں ہندوؤں کے باقی ماندہ اثر پر ایک کاری ضرب ہوگا"

ایسی روشن مثالوں کی موجودگی میں یہ کہنے کیلئے کافی جسارت کی ضرورت ہے، کہ ہندوستان کی آبادی ایک قوم ہے یا ایک قوم بن چکی ہے، یا ہندو اور مسلمان رہتے ہوئے ایک قوم بن سکتی ہے۔ یہ آفتاب سے زیادہ ظاہر ہے کہ اگر قومی امتیاز موجود رہے، اور پھر اسکو غیر موجود فرض کر کے ہندوستان کی آئندہ سیاسی عمارت کا نقشہ بنایا جائے، تو اس میں صرف اس قوم کا فائدہ ہے جو تعداد میں زیادہ اور قوت و اثر کی جگہوں پر پہلے ہی سے قابض ہو، کیونکہ اس طرح وہ پوری کامیابی کیساتھ امتیاز برت کر قلیل التعداد اور کمزور قوم کو اسٹیٹ کی قانون بنانے والی اور قانون نافذ کرنے والی مشین سے بے دخل بھی کرسکتی ہے، اور قومیت متحدہ کا نام لیکر ہر اس شخص کا منہ بھی بند کرسکتی ہے، جو مظلوم قوم کے حقوق کا دعویٰ لے کر اٹھے۔

قومیت کے اس اصول کو پوری طرح نتیجہ خیز بنانے کیلئے ڈیماکریسی کا انگریزی ماڈل اختیار کیا گیا ہے۔ باریک اصطلاحی مسائل کو چھوڑ کر، صاف اور سادہ الفاظ میں ڈیماکریسی کا خلاصہ یہ ہے کہ مجلس قانون ساز (Legislature.) میں تمام امور کا تصفیہ مجرد اکثریت سے ہو، اور اقلیت اُس وقت تک بے اثر رہے، جبتک وہ قوم کی رائے عام کو اپنا ہم خیال بنا کر اکثریت بن جانے میں کامیاب نہ ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں:-

"در اصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے

قابو میں رکھتی ہے" (میری کہانی - جلد دوم - صـ۴۵۵)

اس نوع کی جمہوریت صرف اس ملک کیلیے مناسب ہوسکتی ہے جہاں ایک قوم رہتی ہو، جہاں کے باشندوں میں، تہذیب و تمدن، اصول معاشرت، اور نظریۂ حیات کے اساسی اختلافات نہ ہوں، اور جہاں مختلف گروہوں کے مفاد چاہے کتنے ہی مختلف ہوں، مگر انکے درمیان اجتماعی زندگی میں کوئی امتیاز نہ ہو، یا کم از کم اس حد تک پہنچا ہوا امتیاز تو نہ ہو کہ ایک گروہ کا آدمی دوسرے گروہ والے کے ہاتھ سے پانی تک پینا گوارا نہ کرے - ایسے ملک میں اوّلاً تو کوئی اکثریت دوامی اکثریت (Permanent majority.) نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہاں ہر جماعت کیلیے رائے عام کو اپنا ہم خیال بنا کر اکثریت میں آجانا ممکن ہے - ثانیاً خواہ کوئی جماعت بھی ایسے ملک میں برسر اقتدار ہو، بہر حال اس سے قلیل التعداد جماعتوں کو یہ خوف نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنی قانون سازی، اور تنفیذ قانون کی پالیسی سے انکی قومیت کی اساس پر ضرب لگائیگی، کیونکہ وہاں قومیت تو ایک ہی ہے، اختلافات جو کچھ ہیں محض سیاسی اور معاشی نظریات کے ہیں یا فروعی اغراض و مفاد کے -

برعکس اسکے ہندوستان کی مختلف قوموں کو ایک قوم فرض کرنا، اور پھر اس مفروضہ کی بنا پر ڈیماکریسی کے اس نمونہ کو یہاں رواج دینا، یہ معنی رکھتا ہے کہ یہاں کی قلیل التعداد قوموں پر ایک کثیر التعداد قوم کے امپیریلزم کو مسلط کر دیا جائے - اسلیے کہ یہاں اکثریت بہر حال دوامی اکثریت ہے - کوئی اقلیت، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، یا ہندوؤں کی، اپنے آپ کو اس وقت تک اکثریت میں تبدیل نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ ہندوؤں کو مسلمانوں میں، یا مسلمانوں کو ہندوؤں میں تبدیل نہ کر دے -

---

مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف طبقوں میں معاشی اغراض و مفادات کسی حد تک مشترک ضرور ہیں مثلاً یہ ضرور ممکن ہے کہ ہندو کسان اور مسلمان کسان کا معاشی مفاد ایک ہو، یا ہندو مزدور

اور مسلمان مزدور کی اغراض یکساں ہوں، مگر اول تو صرف معیشت ہی ایک چیز نہیں ہے جو انکی زندگی میں اہمیت رکھتی ہو، بلکہ اس سے اہم تر چیزیں دوسری ہیں جنکے امتیاز و اختلاف نے معیشت کے میدان میں بھی انکے مفادات مختلف کر دیے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہندو اور مسلمان، دونوں قوموں کے مالداروں سے مال چھیننے میں متفق ہو سکتے ہیں، مگر مال چھیننے کے بعد جب اسے تقسیم کرنیکا سوال سامنے آئیگا تو ہندو، ہندو کو ترجیح دیگا، اور مسلمان مسلمان کو۔ ثانیاً اگر ان کا معاشی مفاد بالکل یکساں ہو، تب بھی کوئی مسلمان اپنی زندگی کے سارے معاملات ہندو کو، اور اسی طرح کوئی ہندو اپنی زندگی کے سارے معاملات مسلمان کو محض اس وجہ سے نہیں سونپ سکتا کہ روٹی کے معاملہ میں دونوں کا مفاد یکساں ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ دوسری قوم کا آدمی اس کے مذہبی یا تمدنی یا تعلیمی مسائل کا جسطرح چاہے تصفیہ کر دے۔ ایسی حالت میں محض روٹی کا نام لیکر یہ کہنا کہ ہندو عوام اور مسلمان عوام کے مفاد یکساں ہیں، اسلیے دونوں ایک قوم ہیں، اور دونوں، انگریزی نمونہ کے مطابق ایک ڈیماکریٹک نظام حکومت کو قبول کر سکتے ہیں، صریح دھوکہ بازی ہے، اور اس دھوکہ بازی میں قومی استعلاء (National Aggrandisement.) کا جذبہ پوشیدہ ہے۔ ایسے ڈیماکریٹک نظام حکومت کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ کثیر التعداد قوم، حکومت کے اقتدار پر کلیتہً قابض ہو کر، اور اپنی تعلیمی پالیسی، اپنی قانون سازی، اور تنفیذ قانون کی مشینری سے قلیل التعداد قوموں کے مذہبی عقائد، انکی ذہنیت، انکے نظریات و افکار اور انکے اصول تمدن و معاشرت کو اپنے حسب منشا بدل کر، رفتہ رفتہ اپنی قومیت میں جذب کر لے، اور اگر اس طرح وہ جذب ہونا قبول نہ کریں تو معاشی امتیاز کی پالیسی اختیار کر کے انکو اس قدر تنگ کرے کہ وہ جذب ہونے پر مجبور ہو جائیں۔

ڈیماکریسی کا یہ نظریہ کس طرح کام کر رہا ہے، اسکا اندازہ ذیل کی چند مثالوں سے کیا جا سکتا ہے:-

سنٹرل اسمبلی میں مسٹر داس کا مسودۂ قانون (جسکی رو سے شاردا ایکٹ کو اور زیادہ سخت کر دیا گیا ہے) مسلمانوں کی قریب قریب متفقہ مخالفت کے باوجود، مجرد اکثریت سے پاس کر دیا گیا۔

بمبئی اسمبلی میں میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کیلیے مخلوط انتخاب کا قانون، جس میں مقامی مسلمانوں کو بطور خود مخلوط حلقہائے انتخاب میں شریک ہونے کا اختیار دیا گیا تھا، مجرد اکثریت سے پاس کیا گیا درانحالیکہ مسلمان ارکان کی عظیم اکثریت نے اسکی مخالفت کی تھی۔

مدراس اسمبلی میں محض اکثریت کے زور پر ایک مدت تک بندے ماترم کا گیت گانے کا سلسلہ جاری رہا اور مسلمانوں کو اسکے لیے قیام تعظیمی پر مجبور کیا جاتا رہا۔ حتی کہ اختلاف کرنے والے مسلمانوں کو کرسی صدارت کی طرف سے علانیہ دھمکیاں تک دی گئیں۔

سی پی میں ودیا مندر کی اسکیم مسلمانوں کی متفقہ مخالفت کے باوجود منظور کی گئی اور مجلس نصاب میں ایک مسلمان بھی شریک نہ کیا گیا۔

مدراس اور بمبئی میں اقلیت کی مخالفت کے باوجود محض اکثریت کے زور پر ہندی کو زبردستی رائج کیا جا رہا ہے (اسکے لیے لفظ "ہندوستانی" کا پردہ ان حضرات کو خوب مل گیا ہے جس سے باہر کے لوگ ایک مدت تک اسی دھوکے میں رہیں گے کہ شائد اردو اور ہندی دونوں کو رواج دیا جا رہا ہوگا)

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیماکریسی کے خوشنما پردے کو آڑ بنا کر در اصل اقلیت پر اکثریت کا استبداد قائم کیا جا رہا ہے۔ ایک قوم صرف اس بنا پر کہ اسکی تعداد زیادہ ہے، اپنے آپکو اسکا حقدار سمجھتی ہے کہ دوسری قوم پر جس قانون اور جس طریقہ کو چاہے مسلط کر دے، خواہ وہ اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔ اسوقت تک اس استبداد کی رفتار سست ہے، کیونکہ مسلمانوں کو ابھی پوری طرح پھانسنے میں کامیابی نہیں ہوئی ہے، اور اس سے پہلے انکو بھڑکا دینا خلاف مصلحت سمجھا جا رہا ہے۔ لیکن اگر خدا نے ہم کو عقل دی ہے، تو ہم اب بھی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ڈیماکریسی کا یہ نظریہ

مقالات

تقلید شخصی کے شرعی حدود

(از افادات علامۂ ابنِ تیمیہ رحمہٗ اللہ)

شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہؒ سے پوچھا گیا کہ

(۱) کیا ایک امام کا مقلد دوسرے امام کے پیروؤں کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے؟ کیا اس سے اجتناب کرنا بدعت اور گمراہی ہے؟ اور کیا ایک شخص کسی ایسے امام کے پیچھے بھی نماز پڑھ سکتا ہے جو نماز میں ایسے امور کی بالکل رعایت نہ کرتا ہو جنکی فرضیت اور وجوب تک کا وہ مقتدی قائل ہے؟ مثلاً مقتدی بسم اللہ اور تشہد کی فرضیت کا قائل ہے، قے، رعاف اور حجامت کو نواقض وضو میں سے مانتا ہے، لیکن امام عملاً اور اعتقاداً ان باتوں کی بالکل رعایت نہیں کرتا، اور مقتدی کو اس بات کا علم بھی ہے۔

(۲) ایک مقلد بعض ارکان نماز میں اپنے امام کی مخالفت کرتا ہے۔ کیا یہ مخالفت

بقیہ مضمون صفحہ ۱۷:- آگے چل کر مجلس قانون ساز میں ہماری شریعت اور ہمارے اصول تہذیب و تمدن کی کیسی قطع و برید کرانے والا ہے، اور ہندوستان کی آبادی کو "ایک قوم" بنانے کیلیے اس سے کیا کیا کام لیے جانے والے ہیں۔

(باقی)

اسکے تذبذب پر دلالت کرتی ہے اور کیا اس کی یہ مخالفت اُس (امام کے) مذہب کے اندر بدعت کا فتنہ قرار دی جائیگی ؟

(۳) ایک شخص کسی امام کے مذہب کا مطالعہ کرتا ہے، اس میں تفقہ اور بصیرت حاصل کرتا ہے، پھر اس کے سامنے ایسی احادیث آتی ہیں جو صحیح اور مستند ہیں، نسخ اور تخصیص کے شکوک سے بالاتر ہیں، دیگر نصوص شرعیہ سے ان کا کوئی معارضہ بھی نہیں، لیکن امام کی تقلید میں جو مذہب اس نے اختیار کر رکھا تھا یہ حدیثیں اسکی مخالفت کرتی ہیں، تو کیا ایسی صورت میں اس مذہب کا اتباع جائز ہو سکتا ہے یا اس شخص کیلیے احادیث کا اتباع ضروری ہے ؟

شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا :-

(۱) اختلاف مذہب کے باوجود نماز بلا کسی نقص اور کراہت کے ہو جائیگی - ایسے تمام مسائل میں سلف اپنی رائیں الگ الگ رکھتے تھے، لیکن صحابہؓ، تابعینؒ، ائمہؒ اربعہ اور دیگر تمام علمائے سلف سب کے سب بلا لحاظ اختلاف ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے اور کسی کا ذہن بھی ان اوہام سے دوچار نہ ہوا - انکار تو درکنار، وہ لوگ بھی جنہیں معلّم شریعت کو بالکل قریب سے دیکھنے اور سراجِ نبوت سے براہِ راست روشنی حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، اگرچہ مذکورۂ بالا مسائل میں اختلاف رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کی اقتدا سے کبھی کسی نے احتیاط روا نہ رکھی - احناف اور امام شافعیؒ وغیرہ علماء مالکی ائمہ کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے - خلیفہ رشید نے پچھنے لگوائے اور حسب رائے امام مالکؒ بغیر تجدید وضو نماز کیلیے کھڑا ہو گیا، لیکن امام ابو یوسف نے اسکی اقتدا میں نماز پڑھی اور کوئی لیت و لعل نہ کی - امام احمد بن حنبلؒ رعاف اور حجامت کو ناقض وضو مانتے ہیں، لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھ لیں گے جس نے بدن سے خون نکلنے کے بعد از

سر نو وضو نہ کیا ہو؟ امام علام نے فرمایا کیوں نہیں، سعید ابن المسیب اور امام مالک کے پیچھے تو میں برابر نمازیں پڑھتا ہوں -

صحابہ کرام، تابعین اور تمام ائمہ سنت کا یہ اسوہ ہمارے سامنے ہے - ایسی حالت میں جو شخص اس روشنی کے اتباع سے گریز کرتا ہے، بدعت کے زہر سے اس کا ذہن مسموم ہو چکا ہے - ہدایت کا وہ بدترین دشمن اور کتاب وسنت اور اجماع سلف کا کھلا ہوا منکر ہے

اب اس مسئلہ کے تمام امکانی پہلوؤں پر پھیل کر ایک گہری نظر ڈالو - اس اختلاف کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں :

(۱) مقتدی اس بات سے بالکل بے خبر ہو کہ امام سے ایسے افعال سرزد ہوئے ہیں جو نماز کو باطل کر دینے والے ہیں - ایسی صورت میں ائمہ اربعہ اور علمائے متقدمین یکزبان ہو کر فرماتے ہیں کہ اس کی نماز میں کوئی قباحت نہیں - ہاں بعض متاخرین نے جنکے دماغوں پر تعصب اور جہالت کا کابوس سوار تھا، اسکی بھی مخالفت کی اور کہہ گئے کہ حنفی کے پیچھے نماز جائز نہیں خواہ وہ تمام واجبات کو ادا ہی کیوں نہ کرتا ہو، کیونکہ عملاً انہیں ادا کرنے کے باوجود وہ ان کے وجوب کا تو قائل نہیں - ایسی لایعنی باتوں پر کان دھرنے سے پہلے ضرورت ہے کہ اس مفتی کو اہل بدعت کی طرح توبہ کی دعوت دیجائے - نماز کچھ آج ہی سے نہیں پڑھی جارہی ہے - عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں بھی نمازیں پڑھی جاتی تھیں - اور ہر مسلک کا آدمی دوسرے مسلک والے کے پیچھے بے تکلف نماز پڑھتا تھا، حالانکہ اکثر ائمہ بالکلیہ فرائض وسنن کی کوئی تفصیل اپنے ذہن میں رکھتے ہی نہ تھے، بس شرعی نماز ادا کر دیتے تھے - اگر ان تدقیقات کا علم و اعتقاد نماز کیلیے ضروری مان لیا جائے تو پھر کہنا پڑے گا کہ امت کا سواد اعظم تمام عمر نماز پڑھنے کے باوجود بے نمازی اور نافرمان ہی رہا حقیقت

یہ ہے کہ یہ ایک طرح کی تکلیف مالا یطاق ہے۔ ایسی احتیاط سرے سے ممکن ہی نہیں۔

(۲) دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ مقتدی کو معلوم ہو کہ امام سے ایسے افعال سرزد ہوئے ہیں جو اس (مقتدی) کے نزدیک جائز نہیں، مثلاً امام نے فصد لی یا قے کی اور وضو کئے بغیر مصلائے امامت پر آکھڑا ہوا۔ ایسی صورت میں فقہاء کی دو رائیں ہیں۔ بعض احناف، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا خیال ہے کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوگی کیونکہ وہ تو امام ہی کی نماز نہ ہونے پر اعتقاد رکھتا ہے پھر اسکی نماز کیونکر ہوگی۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ اس صورت حال میں بھی اس مقتدی کی نماز ہو جائیگی۔ تمام ائمۂ سلف اور امام مالکؒ کا یہی خیال ہے، بلکہ امام شافعی، احمد اور ابو حنیفہ سے بھی بعض سلسلے یہی روایت کرتے ہیں اور یہی خیال صحیح اور موافق سنت ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ

"آپ نے فرمایا، تمہارے امام تمہاری نمازیں پڑھاتے ہیں، اگر انہوں نے ٹھیک ٹھیک نماز ادا کی تو تم اور وہ دونوں مستحق اجر و ثواب ٹھیرے، اور اگر انہوں نے نماز میں لغزشیں کیں تو تمہارا اجر تو کہیں گیا نہیں، وہ البتہ ماخوذ ہونگے"۔

دیکھو رسول اللہ صلعم نے کس طرح کھول کر فرما دیا ہے کہ امام کی کوتاہیاں مقتدی پر کوئی اثر نہیں ڈالتیں۔

پھر ایک اور پہلو سے غور کرو۔ حقیقت اور زیادہ نکھر کر سامنے آجائیگی۔ مقتدی کو یہ بات تو معلوم ہے کہ امام کا یہ طرزِ عمل خود امام کے خیال اور اعتقاد کے مطابق بالکل جائز ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے اس طرزِ عمل پر کوئی بازپرس نہ ہوگی۔ اس رائے میں یا تو وہ امام بذات خود مجتہد ہوگا یا کسی دوسرے مجتہد کا مقلد ہوگا۔ بصورت اول، یہ بات معلوم

ہے کہ اجتہاد کی خطا بھی باعثِ اجر و مغفرت ہوتی ہے، لہذا اسکی نماز کی صحت یقینی ہے بصورت دیگر خطا و صواب کی تمام ذمہ داری اس امام پر ہوگی جس کا وہ مقلد ہے۔ اسکے مذہب کے پیشوا نے اگر غلطی کی ہے تو اس کی پاداش میں خود اس بیچارے کے اعمال نہیں ضائع ہو سکتے۔ بہرحال اگر امام نے کسی مجتہد کی تقلید میں یا اپنے ذاتی اجتہاد کی رہنمائی میں کوئی فعل اختیار کیا اور مقتدی نے اپنے واجبات کو اپنے طور پر ادا کر لیا تو اب اس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا یقیناً لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا کی صریح مخالفت ہے۔ نمازیں دونوں کی ہوگئیں اور دونوں نے تکلیف شرعی کے حقوق ادا کر دیے، درانحالیکہ ظاہری افعال میں امام و مقتدی کی موافقت بھی پوری پوری موجود ہے۔

اور مخالفین کا یہ کہنا تو بالکل ہی غلط ہے کہ مقتدی کو امام کی نماز باطل ہو جانے کا یقین ہے۔ کیونکہ مقتدی اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہے کہ امام نے وہ تمام افعال پورے کر دیے ہیں جو اس پر واجب تھے اور اگر اس کے علم اجتہاد نے کوئی لغزش کھائی بھی ہے تو خدا اسے معاف کر دیگا۔ اسکی نماز پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ تم دیکھتے ہو کہ بعض اوقات امام کو نماز میں سہو ہو جاتا ہے اور اسکی متابعت میں مقتدی بھی اس سہو کا ارتکاب جانتے ہوئے کر بیٹھتے ہیں، لیکن انکی نماز باطل نہیں ہوتی۔ تو پھر جب صرف امام ہی اکیلا ایک غلطی میں گرفتار ہو تو مقتدیوں کی نماز کیوں خراب ہوگی۔ پس اقتدا کے شرائط میں سے یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ امام کے حالات اور اعتقادات کا جائزہ لیا جائے، بلکہ ایک اجنبی شخص کے پیچھے بھی جس کے متعلق مقتدی کو کچھ بھی واقفیت نہ ہو نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں کیلیے ضروری ہے کہ امام کے اتباع سے اس وقت تک بالکل انکار نہ کریں جب تک وہ نماز میں ایسے افعال نہیں کرتا جسکی کوئی اصل شریعت میں سرے

سے موجود ہی نہ ہو، کیونکہ شارع کا ارشاد ہے کہ "امام بنایا ہی اسی لیے گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے" اگر امام نماز میں رفع یدین کرتا ہے اور مقتدی نہیں کرتا، یا مقتدی کرتا ہے امام نہیں کرتا، یا دونوں کرتے ہیں، یا ایک شخص بعض وقت ہاتھ اٹھاتا ہے اور بعض اوقات نہیں اٹھاتا، ان تمام باتوں سے کسی کی نماز میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوسکتی۔ اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ اور کسی کیلیے جائز نہیں کہ کسی خاص امام کی رائے کو مذہبی شعار قرار دیکر اسکے اتباع کو واجب کہے، اور اسکے خلاف جو مستند حدیثیں مروی ہیں انکے اتباع سے روکے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ رسول پاک سے جو کچھ اور جیقدر ثابت ہے، اسکی وسعت اپنی جگہ پر قائم رہیگی۔ مثال کے طور پر اذان و اقامت کو لو کہیں تو مروی ہے کہ آپ نے اذان میں ہر کلمہ کو دُہرانے اور اقامت میں صرف ایک ایک بار کہنے کا حکم دیا، اور کہیں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اذان اور اقامت دونوں میں دُہراؤ۔ اب اس وسعت کے پیش نظر جو شخص اقامت کے اندر ان کلمات ماثورہ کو دہراتا ہے وہ بھی حق پر ہے، اور جو صرف ایک ہی بار کہتا ہے وہ بھی حق پر۔ لیکن جو شخص اس وسعت میں تنگی پیدا کرنا چاہتا ہے اور دونوں طریقوں میں سے ایک ہی کو واجب العمل اور منصوص قرار دیتا ہے، وہ راہِ حق سے بھٹکا ہوا ہے اور سنت پر ظلم کرتا ہے۔ لیکن آج پورا عالم اسلامی اس بدبختی اور گمراہی کا شکار ہے اتنی بڑی امت کا کوئی شیرازہ ہی نہیں۔ ہر ایک تعصب کے نشۂ باطل سے سرگراں ہے۔ صرف اپنے ہی امام کو سب کچھ سمجھ کر دوسرے تمام ائمۂ دین اور مجتہدین ملت کو کچھ نہ سمجھنا پکے ایمان کی نشانی قرار پا چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس اختلاف اور تشتت سے اسلام نے بار بار منع کیا تھا، وہی آج مسلمانوں کا طغرائے امتیاز، بلکہ قومی شعار بن چکا ہے۔ ایسے متشددین سب کے سب قابل نفریں، گمراہ، ہوا پرست اور ہدایت سے یکلخت ناآشنا ہیں۔ ان میں اتنی

سمجھ بوجھ بھی نہیں کہ اتحاد ملی اور ایک مرکز سے وابستگی دین کے بنیادی اصول میں سے ہے اور جن چھوٹی چھوٹی اختلافی باتوں پر وہ فرقہ بندیاں اور ہنگامہ آرائیاں کرتے رہے ہیں وہ دین کے خفیف ترین فروع میں سے ہیں۔ جڑوں کو کاٹ کر شاخوں کو ہری رکھنے کی کوشش کرنا دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔

لطف یہ ہے کہ ان دلدادگان تعصب کو کتاب و سنت سے کچھ یوں ہی سا واسطہ ہے۔ انکے استدلال کی پوری عمارت ضعیف روایتوں، چند سنی سنائی باتوں اور بعض علماء اور شیوخ کی طرف منسوب کی ہوئی آراء پر قائم ہے۔ جو آراء علماء سلف کی طرف منسوب ہیں ان کے متعلق جزم کے ساتھ یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ انہیں کی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس انتساب میں جھوٹ اور افترا سے کام لیا گیا ہو، اور اگر انہیں صحیح بھی مان لیا جائے تو آخر وہ علما معصوم تو نہیں۔ عصمت تو محض مقام نبوت کیلیے مخصوص ہے جہاں کا ہر قول وحی الہٰی اور ہر رائے حق کی ترجمان ہے، اور صرف وہی ایک مرکز ہدایت ہے جبکی کامل اطاعت ہر انسان پر فرض کی گئی ہے فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ نبی کی ایک ادنیٰ سی مخالفت کرنا عذاب الہٰی کو دعوت دینا ہے۔ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ الخ

(۲) اگر ایک شخص کسی امام کا مقلد ہے، لیکن بعض مسائل میں کسی دوسرے امام کی رائے اُسے زیادہ صائب اور قوی نظر آتی ہے، اس لیے وہ تقلید جامد کے اصولوں کو پس پشت ڈال کر اپنے یقین کے مطابق دوسری رائے کا اتباع کرتا ہے، تو اس کا یہ طرز عمل روح اسلام کے بالکل مطابق ہے۔ اُس کی دیانت اور عدالت پر باتفاق علماء کوئی رد و قدح

نہیں ہو سکتی - بلکہ وہ اُس اندھے مقلد کی بہ نسبت حق سے زیادہ قریب اور اللہ اور اسکے رسول کے نزدیک زیادہ محبوب ہے، جو نبیؐ معصوم کے ساتھ ساتھ کسی امام معیّن کو بھی واجب الاتباع سمجھتا ہے، اور ہر اُس رطب و یابس کو جسکی نسبت اسکے امام کی طرف ہے دوسرے ائمہ کی رایوں کے مقابلہ میں فروری الاطاعت سمجھتا ہے، خواہ وہ رائیں اپنے اندر کتنی ہی زیادہ صداقت اور محکم دلیلیں کیوں نہ رکھتی ہوں - تقلید کے باب میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ عامی کیلیے کسی امام کا اتباع جائز یا بہتر یا واجب ہے - لیکن کسی خاص امام کی تعیین نہیں کی جا سکتی اور نہ کوئی مسلم کر سکتا ہے - بخلاف اس کے جو شخص تمام ائمہ سے حسن عقیدت رکھتا ہو اور ہر ایک کی اُس رائے کی پیروی کرتا ہو جو اس کے نزدیک کتاب و سنت سے زیادہ اقرب اور اوفق معلوم ہوتی ہو، وہ حق کی روشن ترین شاہراہ پر ہے اور دوسروں کی بہ نسبت زیادہ صحیح ہدایت اُسے حاصل ہے - اس پر نفاق اور تذبذب کا اتہام لگانا انتہائی شقاوت ہے - تذبذب و نفاق اور رسوخ ایمان کی حقیقت قرآن و سنت میں بار بار بیان کی گئی ہے - وہاں تذبذب کا معیار رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسائل نہیں ہیں بلکہ حب للہ و بغض للہ ہے (اسکے بعد شیخ نے آیات و احادیث سے اسکی تفصیل بیان کی ہے)۔

ائمۂ دین کا راستہ تو صحابہؓ کا راستہ ہے - صحابۂ کرام کا حال یہ تھا کہ حق کی محبت انہیں ایک شیرازے میں باندھے ہوئے تھی، جسکا نام حبل اللہ ہے - اگر بعض فروع شرعیہ میں وہ باہم گر مختلف ہوئے تو ان کا یہ اختلاف بھی فیضان رحمت اور اگر کسی ایک رائے پر سب متفق ہو گئے تو یہ اتفاق یا اجماع بھی ہمارے لیے شرعی حجت - اب جو شخص تعصب کی بیماری میں مبتلا ہو کر تمام ائمہ کو چھوڑ کر ایک ہی امام کو واجب الاتباع اور مرکز ہدایت سمجھتا ہے اس کی مثال بعینہ اُس شخص کی سی ہے جو تمام اصحابؓ رسولؐ کو چھوڑ کر ایک خاص صحابی میں رشد و ہدایت کو مرکوز کر دیتا ہے، مثلاً روافض جو حضرت علیؓ کے

تعصب میں خلفائے ثلثہ بلکہ جمہور صحابہؓ کو نعوذ باللہ کیا کچھ نہیں کہتے اور سمجھتے ، یا خوارج جو حضرت علی و عثمان رضی اللہ عنہما کو دائرۂ اسلام میں رکھنے تک سے انکاری ہیں ۔ ایسے لوگوں کو حق اور ہدایت سے کوئی واسطہ نہیں ۔ یہ بدعت کے علمبردار اور ہوا پرستی کے امام ہیں جن پر قرآن نے لعنت برسائی اور سنت نے نفرین بھیجی ہے ۔ انہوں نے جو راہ اختیار کی وہ رسول کی بتائی ہوئی راہ سے بالکل مختلف ہے ۔ پس جو کوئی بھی کسی خاص امام کے بارے میں تعصب کو اپنا شیوہ قرار دیتا ہے ۔ وہ اک گونہ ان گمراہوں سے تشبہ اختیار کرتا ہے خواہ وہ حنفی ہو یا مالکی، شافعی ہو یا حنبلی یا کسی اور کا مقلد ۔

اب ایسے اندھے متعصب کے انجام پر ایک نگاہ ڈالو ۔ ایک طرف تو وہ تعصب کی اس سرشاری میں خدا کے عطا کردہ علم دین سے بیخبری کا ثبوت دیتا ہے ۔ دوسری طرف وہ دیگر ائمہ و مجتہدین کے مقام علم و عرفان سے غفلت برتتا بلکہ انکار کرتا ہے ۔ گویا بیک حرکت جہل اور ظلم دوگناہوں کا ارتکاب کرتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ ہمیں علم اور عدل کا حکم دیتا اور ظلم و جہل سے روکتا ہے کہ فسق و فجور، تمرد و طغیان اور فتنہ و فساد کے یہی دو سر چشمے ... ہیں ۔ جن سے دامن بچانا ہی اللہ تعالیٰ کی امانت کا ایفاء ہے، جس نے فرمایا ہے " وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ الی آخر السورہ "

امام ابو یوسف اور امام محمدؒ سے بڑھ کر امام ابو حنیفہ کا پیرو اور ان کے اقوال کا صحیح علم رکھنے والا کون ہو سکتا ہے ، لیکن انہوں نے بے شمار مسائل میں ان سے اختلاف کیا ہے ، کیونکہ دلائل اور سنن کی روشنی ان کے سامنے پھیلتی گئی اور انھیں وہ چیزیں ملتی گئیں جنکا اتباع ، کسی غیر معصوم انسان کے اقوال کے مقابلہ میں راجح اور ضروری تھا ۔ مگر اس اختلاف کے باوجود وہ حنفی ہیں اور ان سے بڑھ کر امام کا قدر شناس اور عاشق کوئی نہیں ۔ انھیں تذبذب کا بیمار کون کہہ سکتا ہے ۔

ذرا آگے بڑھو خود امام ابوحنیفہ اور دوسرے ائمۂ مجتہدین کو دیکھو، وہ کس طرح ایک رائے قائم کرتے ہیں، لیکن بعد میں جب اس رائے کے خلاف دلائل سامنے آتے ہیں تو بلا تکلف اپنی پہلی رائے کو چھوڑ کر دوسرا مسلک اختیار کر لیتے ہیں اور انھیں کوئی مذبذب نہیں کہتا۔ کیونکہ حقیقت کی تلاش اور علم و ایمان کی جستجو ہی تو انسانیت کا جمال ہے۔ اللہ تعالیٰ سکھاتا ہے کہ تم ازدیادِ علم کی دعا مانگو

وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْماً۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مومن کیلیے ضروری ہے کہ تمام مومنین اور علماء سے موالات رکھے، سچ کی ٹوہ میں رہے، اور اسے جہاں پائے اپنالے، اور یقین رکھے کہ مجتہد کی رائے اگر ٹھیک ہے تو اسے دو اجر اور اگر غلط ہے تو ایک اجر ضرور ملے گا اور اسکی خطا بہر حال معاف ہے۔

(۳) کتاب و سنت اور اجماعِ امت سے یہ بات ثابت ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر صرف اپنی اور اپنے رسولِ معصوم کی اطاعت فرض کی ہے۔ رسول کو چھوڑ کر کسی بڑے سے بڑے انسان کی اطاعت بھی اُسکے تمام اوامر و نواہی میں اس امت پر واجب نہیں حتی کہ وہ جسے صدیقِ امت کہا گیا، انبیاء کے بعد جسکی افضلیت تمام انسانوں پر مسلم مانی جاتی ہے، جو صبغۃ اللہ کا پیکر اور مقامِ رسالت کا سب سے بڑا رمز شناس تھا وہ بھی کہا کرتا تھا کہ جب تک میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں تم میری اطاعت کرو لیکن جب میں اسکی نافرمانی کرنے لگوں تو تم بھی میری اطاعت سے آزاد ہو۔ اور اس پر تو تمام علماء کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ کو چھوڑ کر کوئی بشر بھی امر و نہی کے تمام احکام میں معصوم نہیں ہو سکتا۔ غلطی تو بشریت کا خاصہ ہے۔ اسی بنا پر بعض ائمہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر انسان کے اقوال دو قسم کے ہوتے ہیں، کچھ تو لے لینے کے قابل ہیں اور کچھ ترک دینے کے، الا رسول اللہ صلعم۔

ائمۂ اربعہ رضی اللہ عنہم نے خود لوگوں سے فرمایا ہے کہ وہ انکے ہر قول کی تقلید نہ کریں

اور در حقیقت یہ بات لوگوں کیلیے ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہماری رائے ہے، اگر کوئی اس سے بہتر رائے پیش کرے تو ہم اسے قبول کریں گے۔ حق پسندی کی یہ اسپرٹ زمانۂ حج میں ایک بار عملاً ظاہر ہوئی۔ امامؒ موصوف کے سب سے افضل اور رشید شاگرد امام ابو یوسف امام مالکؒ کے پاس آئے اور ان سے سبزیوں کی زکوٰۃ اور "صاع" کے متعلق مسائل پوچھے، آپ نے سنت نبوی کا فیصلہ سنا دیا، امام ابو یوسف نے فوراً فرمایا کہ میں نے اپنی رائے سے رجوع کیا، اور اگر امامؒ (یعنی ابو حنیفہ) اس وقت ہوتے تو وہ بھی ایسا ہی کرتے۔

امام مالکؒ کی تعلیم تھی کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔ میری رائے صائب بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ لہذا میرا ہر قول کلام اللہ اور فرمان رسول پر پرکھ لیا کرو۔

امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی صحیح حدیث تمہارے سامنے آئے تو میری رائے کو دیوار پر دے مارو، جو رائے اپنے گرد وپیش دلائل کا حصار رکھتی ہو اسی کو میری رائے سمجھو۔

امام احمدؒ کہا کرتے تھے نہ میری تقلید کرو نہ کسی اور امام کی، بلکہ جس طرح ہم نے علمِ شریعت سیکھا تم بھی سیکھو۔ کسی انسان کیلیے جائز نہیں کہ لوگ اس کی تقلید کریں، تم اپنے دین کی زمام انسانوں کے ہاتھوں میں نہ دو کہ وہ غلطی سے ہرگز مامون نہیں ہو سکتے۔

صحیح بخاری میں ہے

مَنۡ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیۡرًا یُّفَقِّهۡهُ فِی الدِّیۡنِ جسکا اللہ بھلا کرنا چاہتا ہے، اسے دینی بصیرت سے نوازتا ہے

اب ذرا تصویر کے دوسرے رخ پر نظر ڈالو۔ اس ارشاد کا لازم کیا ہے؟ یہی نا کہ جسکو تفقُّہ فی الدین کی نعمت نہیں حاصل اس سے فیضِ کل کی نظریں پھری ہوئی ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ تفقہ فی الدین کی تحصیل ہر مومن پر حسب استطاعت واجب ہے۔ تفقُّہ فی الدین نام ہے سماعی دلائل کے ساتھ احکام شرعیہ کی معرفت کا۔ جسے یہ چیز حاصل نہیں وہ تفقُّہ سے بھی محروم ہے۔ مگر یہ

ظاہر ہے کہ انسانوں کا ایک بڑا طبقہ دینی مسائل کے تمام تفصیلی دلائل پر حاوی نہیں ہو سکتا، سو جن خفایا کی معرفت سے وہ واقعی عاجز ہیں، وہ ان کے مکلف بھی نہیں، لیکن جن پر وہ قدرت رکھتے ہیں ان کا حصول تو فرض ہے۔ جو لوگ استدلال پر پوری طرح قادر ہوں ان کے لئے بعض علماء کے نزدیک تقلید مطلقاً حرام ہے، بعض کے نزدیک مطلقاً جائز ہے، اور تیسرا مذہب یہ ہے کہ ایسے افراد کیلیے ضرورت کے وقت تو تقلید جائز ہے مثلاً وقت کم ہے اور استدلال و تحقیق کا موقعہ نہیں، لیکن جب کوئی مجبوری نہ ہو تو پھر جائز نہیں، اور یہی قول زیادہ راجح اور معتدل ہے۔

اجتہاد کا نام سُن کر لوگ گھبراتے ہیں گویا اسے فلسفہ کی بولی میں وہ ایک بسیط شے مانتے ہیں کہ جب تک انسان تمام مسائل اور تمام ابواب دین میں پوری مہارت کے ساتھ اجتہاد نہیں کر سکتا، اُسے مسندِ اجتہاد پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں۔ حالانکہ حقیقت امر اس کے برعکس ہے۔ اجتہاد کوئی بسیط شے نہیں جو تجزی اور انقسام کو قبول نہ کرسکے، بلکہ ایک انسان بعض فنون یا بعض مسائل میں قدرت اجتہاد نہ رکھنے کے باوجود، دوسرے فنون اور مسائل میں مجتہد ہو سکتا ہے، یعنی ہر انسان کا دائرۂ اجتہاد اس کی طاقت کے لحاظ سے تنگ یا وسیع ہوتا ہے۔

اب اگر ایک شخص کسی ایسے مسئلہ میں غور و فکر کرتا ہے جس میں علما کی رائیں مختلف ہیں اور دلائل و نصوص پر گہری نظر ڈالکر اس کا ضمیر فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں امام کا مذہب زیادہ قوی ہے اور نصوص شرعیہ اُسی کی تائید میں ہیں، تو اس وقت اس کے لیے دو راہیں ہونگی۔ اگر وہ ضعیف و مرجوح مذہب کو محض اس لیے اختیار کریگا کہ وہ اُس امام کا مذہب ہے جسکی تقلید کا وہ عہد کرچکا ہے اور قوی مذہب کے دلائل کو حق جاننے کے باوجود چھوڑ دیگا تو یہ حق پرستی نہیں بلکہ عادت پرستی ہوگی جس کیلیے شرع میں کوئی حجت نہیں۔ اور اگر اس کا ضمیر اس بے جا عادت پرستی سے متاثر

اور مرعوب نہیں ہے تو وہ اُسی پہلے قول کا اتباع کریگا جسکی صحت اور حقانیت کا وہ معترف ہوچکا ہے۔ ایسی حالت میں دوسرے امام کا اتباع اس پہلے امام کے اتباع کا قائم مقام ہوجائیگا جس کا وہ مقلد ہے، اور نصوص کی دانستہ خلاف ورزی سے بھی اس کا دامنِ عمل پاک رہیگا اس لیے یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور پسندیدہ ہے۔ چونکہ ایسا شخص کمال اجتہاد کے مرتبہ پر فائز نہیں ہے، اور یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ اس کا قصور نظر مسئلہ کے تمام گوشوں پر حاوی نہیں ہوسکتا اور اُس کا فیصلہ مجتہدانہ فیصلہ نہیں کہا جاسکتا، اس لیے ہم نے یہ بات بہت اتر کر کہی۔ ورنہ جو شخص اپنے اندر اجتہاد کی پوری اہلیت رکھتا ہو اور جسکی وقتِ نظر مسئلہ کے اصلی خط و خال کو دیکھ رہی ہو، اور جسے یقین ہو کہ یہ مذہب نصوص شرعیہ کے مقابلہ میں کوئی جان نہیں رکھتا، اس پر تو ان نصوص کا اتباع واجب ہوگا اور اگر اس انشراح حقیقت کے باوجود وہ تقلید کے عشق میں سرشار رہے تو اس سے بڑھکر جہل پرست اور خدا و رسول کا نافرمان کوئی نہیں۔

مقلدین کا ایک اور گروہ بھی ہوتا ہے جو ہٹ دھرم تو نہیں ہوتا مگر اسکو اپنے امام سے حُسنِ ظن بہت ہوتا ہے۔ ان کے سامنے جب ایسی صورتِ حال پیش آتی ہے اور اپنے مذہب کے مقابلہ میں نصوص کی قطعیت یا ترجیح ان کو واضح طور پر دکھائی دیتی ہے، تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے مسلک کی تائید میں اور زیادہ راجح دلیلیں ہونگی جنکا ہمیں علم نہیں۔ ان کے حسنِ ظن کی توہین تو ضرور ہوگی مگر انہیں ہم بتا ہی دیں کہ قرآن کا تم سے صرف اتنا ہی مطالبہ ہے کہ اپنی قوت اور استطاعت کے مطابق تقویٰ اختیار کرو فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ اسی طرح حضور رسالتماب کا ارشاد ہے اذا امرتکم بامر فاتوا منه ما استطعتم۔ یعنی جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو بقدر استطاعت اس پر عمل کرو۔ اس آیت اور حدیث کی روشنی میں غور کرو کہ تم نے حسبِ استطاعت اس مسئلہ کی چھان بین کرلی۔ اس جستجو میں جو کچھ تمہارے ہاتھ آیا

وہ یہی ہے کہ وہ دوسرا قول راجح ہے، اب تم امام کی جلالت شان کو نہ دیکھو، بلکہ حق کو دیکھو۔
تم پر اس کا اتباع فرض ہو گیا۔ ہاں اگر بعد میں چلکر ان نصوص سے بھی بڑھکر قوی اور مستند
دلائل تم نے پا لیے تو تم پھر رجوع کر سکتے ہو۔ یہ تمہارا تذبذب اور اتباع نفس نہ ہوگا بلکہ
حق کی محبت اور روشنی کی تلاش ہو گی۔ تمہارا حکم بالکل اس مجتہد کا سا ہوگا جو وضوح حق کے
بعد ایک قول سے دوسرے قول کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ رجوع قابلِ ستائش اور خدا کی
نگاہوں میں محبوب ہے، اور اس متعصب کی ہٹ دھرمی خدا کو محبوب نہیں جو روشن راہ کو چھوڑ کر
تاریک راہ چلنے پر مصر ہو۔ اور اسکے ساتھ وہ شخص بھی قابلِ مذمت ہے جو محض عادت کی
بنا پر یا سہل پسندی اور نفس پرستی کا شکار ہو کر ہمیشہ نئے نئے طریقے ڈھونڈ ھتا رہتا
ہو اور ایک رائے سے دوسری رائے کی طرف رجوع کیا کرتا ہو۔

رہ گیا کسی امام مجتہد کا ایک حدیث کو سُن کر اسے ترک کر دینا، خصوصاً جب اس نے
اسکی روایت بھی کی ہو، سو اس کے بہت سے اسباب ہیں اور مختلف وجوہ کی بنا پر وہ معذور ہیں،
جنکی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن یہ عمل ہمارے لیے اسوہ نہیں ہو سکتا، اور محض انکے طرزِ عمل سے
فائدہ اٹھا کر کوئی نصوص کو ٹھکرانے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ حدیث کو ترک کرنے میں معذور ہیں
اور ہم انکے اقوال کو ترک کرنے میں معذور ہیں۔

فرض کرو ایک شخص کسی حدیث پر عمل نہیں کرتا۔ اس کا اعتقاد ہے کہ ظاہر قرآن اُس سے
متعارض ہے اور ظاہر قرآن پر عمل کرنا اسکے نزدیک تمام حجج شرعیہ پر مقدم ہے۔ ایسے شخص کو
بہرحال معذور سمجھا جائیگا۔ لیکن اسکا عذر کسی دوسرے کے حق میں عذر نہیں بن سکتا،
کیونکہ حقائق شرعیہ کا ظہور و خفا تمام اذہان و عقول کیلیے یکساں نہیں، خصوصاً ایسی صورت
میں جبکہ اس تارک حدیث کو اس بات کا اعتقاد اور یقین ہو کہ صحابہ و تابعین نے اس حدیث

پر عمل نہیں کیا اور انکا عمل نہ کرنا کھلا ہوا قرینہ ہے اس بات کا کہ اس حدیث میں کوئی نہ کوئی علت ضرور ہوگی مثلاً وہ منسوخ ہوگی یا کسی دوسری نص کے مقابلہ میں کمزور اور مرجوح ہوگی۔ لیکن اس کے بعد ایک شخص اور زیادہ کاوش و تدبّر سے کام لیتا ہے اور اس پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ نہیں قرن اول میں بالکلیہ یہ حدیث متروک العمل نہیں تھی بلکہ ایک جماعت کا اس پر عمل رہ چکا ہے۔ اسی قسم کے اور نہ معلوم کتنے امکان پیدا ہوسکتے ہیں۔ پھر کسی طالب ہدایت کیلیے کیونکر زیبا ہے کہ وہ ایک رائے کے اتباع میں نصوص سے روگردانی کرے۔

ایک اور فقرہ ہے جو ہر ایسے آزاد خیال اور جویائے حق پر فوراً چست کیا جاتا ہے یعنی "آپ زیادہ علم کتاب کے جوہر شناس ہیں یا فلاں امام؟" فلاں امام کا علم و دانش مسلم۔ مگر یہ تقابل بھی سراسر جہل ہے۔ یہ غریب خود اس امام کی مخالفت کب کر رہا ہے بلکہ اسکی مخالفت تو اسی جیسے صاحب علم و ایمان امام نے کی ہے۔ اس کا قصور اگر ہے تو صرف یہ کہ یہ ایک دوسرے امام کی رائے کو زیادہ صحیح اور تشفی بخش سمجھ کر اختیار کر رہا ہے۔ ان ائمہ کی نسبت آپس میں ایسی ہی ہے جیسی حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، معاذؓ، ابن مسعودؓ، عثمانؓ، علیؓ رضی اللہ عنہم ائمہ دین میں تھی۔ یعنی جس طرح یہ صحابہؓ اختلاف رائے میں ایک دوسرے کے مقابل آ کھڑے ہوتے اور جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیدا ہوتا تو کتاب و سنت سے اس کا محاکمہ کرایا جاتا، اور گو ان کے مراتب علم میں بہت بڑا فرق ہوتا مگر کبھی حق و اتباع کا انحصار کسی کی بزرگی اور علمی برتری پر نہ رکھا جاتا تھا، بعینہٖ یہی حال ان ائمہ کے باہمی اختلاف رائے کا بھی ہے جنکی تقلید کی جاتی ہے۔ تو پھر ہم ان کے بارے میں اسوۂ صحابہ کی پیروی کیوں نہ کریں؟

تیمم کے بارے میں لوگوں نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی رائے پر حضرت ابوموسیٰ اشعری وغیرہ کی رائے کو ترجیح دی، محض اس وجہ سے کہ انہوں نے کتاب و سنت سے

اپنی رائے کو حق ثابت کر دکھایا، ورنہ علم اور تفقہ کے اعتبار سے وہ ان لوگوں سے کہیں کم تھے۔ اسی طرح انگلیوں کی دیت کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت عمرؓ کی رائے رد کر دی گئی اور حضرت امیر معاویہؓ کی رائے پر عمل کیا گیا کیونکہ ان کے پاس فرمانِ رسالت کی سند تھی۔ حضرت ابنِ عباسؓ سے متعہ کے بارے میں مناظرہ کرتے ہوئے کسی نے کہہ دیا کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کا یہ قول ہے۔ ابنِ عباسؓ سرخ ہو گئے اور فرمانے لگے قریب ہے کہ تم پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہونے لگے۔ میں کہتا ہوں کہ رسولؐ اللہ نے یوں فرمایا ہے اور تم زید و بکر کا نام لیے جا رہے ہو۔ اسی مسئلہ میں حضرت ابنِ عمرؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ عمرؓ تمہارے لیے زیادہ قابلِ اتباع ہیں یا رسول اللہ صلعم؟ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ بلکہ تمام صحابہ کے مابین شیخین علم و معرفت کے صدر نشین تھے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اگر شخصیت پرستی کا یہ دروازہ کھول دیا جائے تو تمام دین فتنوں کی آماجگاہ بن جائیگا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ و رسول کی نافرمانی عام اور وحدتِ ملی پارہ پارہ ہو جائیگی۔ ہر امام نبی بن جائیگا، اس کی ایک مستقل امت ہوگی اور ایک مستقل شریعت، یعنی نصاریٰ کی طرح اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی مثال بدرجہ بہی صادق آجائیگی۔

(ماخوذ از فتاویٰ ابنِ تیمیہ)

معرکۂ اسلام وجاہلیت

بدء الاسلام غریبًا وسیعود غریبا

(از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی)

انسانی تخلیق کے پہلے ہی دن سے عقل صحیح اور جہالت میں ایک مسلسل جنگ برپا ہے۔ عقل صحیح کا سرچشمہ انسان کی سلیم اور بے آمیز فطرت ہے۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ نفس کے حیوانی رجحانات کا تزکیہ کرے، اس کو مہذب اور شائستہ بنائے، اس کی محرک طاقتوں کو اخلاق وروحانیت کی بلندیوں تک پہنچنے میں استعمال کرے، اسکی لذت طلب سرشت کو علم ومعرفت اور فضائل اخلاق سے لذت حاصل کرنے کا خوگر بنائے، اور اس کی طالب کمال فطرت میں حیوانات سے نہیں بلکہ فرشتوں سے بازی لے جانے کی طلب پیدا کردے۔ اس کے برعکس جہالت کا سرچشمہ نفس حیوانی ہے جو انسان کو محسوسات اور مادیات کا غلام اور خواہشات کا بندہ بنا دیتا ہے۔ وہ آدمی کے ذہن سے اس شعور کو محو کردینا چاہتا ہے کہ وہ انسان ہے، اور ہر وقت اس شعور کو تازہ کرتا رہتا ہے کہ وہ بس ایک اونچے درجے کا حیوان ہے۔ اسکی پیہم کوشش یہ ہے کہ عقل کو اپنا تابع فرمان بنا کر حیوانی کمالات تک پہنچنے کیلیے اس سے خدمت لے۔ دنیا کی محبت، انجام سے غفلت، لذات جسمانی میں سرمستی ظلم وعدوان، کبر ونخوت، استکبار وافساد فی الارض وغیرہ تمام رذائل اسی سے پیدا ہوتے

اور اسی کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں، یہانتک کہ جب سب سے آخری زینہ پر اس کا قدم پہنچ جاتا ہے، اس وقت بھی انسان یا تو خدا کے وجود ہی سے منکر ہو جاتا ہے یا خود خدائی کے عرش پر جا بیٹھتا اور "انا ربکم الاعلیٰ" کا اعلان کر دیتا ہے۔

دنیا کے کارخانے میں یہی دو طاقتیں کارفرما ہیں: عقل اور جہل۔ اور انہی کی زیادہ کھلی ہوئی تعبیر حق اور باطل ہے۔ یہ سارا ہنگامۂ عالم انھیں کی باہمی کشاکش کا نتیجہ ہے۔ زندگی کی ساری تگ و دو انھیں کے دم سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کو ایک آزمایش گاہ کہا جاتا ہے کیونکہ انسان کی کامیابی و ناکامی کا دارومدار اسی پر ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کس کی طرف کھنچتا، اور کس کے تقاضوں کو قبول کرتا ہے۔ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد واقع ہوئی ہیں۔ دونوں میں ایک فطری بعد ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا۔ دونوں کی ماہیتیں جدا جدا اور خواص مختلف ہیں۔ ایک کا فروغ دوسرے کی موت ہے۔ رات کی تاریک فطرت کسی ذرہ پر آفتاب کا تسلط پسند نہیں کرتی اور نہ آفتاب کی تیز نگاہیں کسی جگہ تاریکی کا کوئی نشان دیکھ سکتی ہیں۔ یہی حال عالم باطن کے نور و ظلمت کا ہے۔ بلکہ حق و باطل کی معرکہ آرائیاں کچھ اس سے بھی زیادہ سخت اور بے لاگ ہوتی ہیں۔ یہاں مصالحت کا کوئی امکان نہیں۔ جس طرح باطل کی ہر ادا حق کیلیے گھناؤنی، اجنبی اور ناقابلِ برداشت ہوتی ہے، اسی طرح سچائی کی ہر صدا باطل کیلیے غیر مانوس اور بیگانہ ہوتی ہے دونوں مختلف جہتوں سے سرشت انسانی پر حملے کرتے ہیں۔ اسی کشمکش میں انسان کی آزمائش ہوتی ہے۔ اور انھیں کی ہار جیت پر بنی آدم کی سعادت و شقاوت کا انحصار ہے۔

عقل اور جہل، حق اور باطل، نور اور ظلمت کی اس کشمکش میں دو طاقتیں دو مختلف سمتوں سے اپنے اپنے نمائندوں کی مدد کیلیے آتی ہیں۔ ایک شیطانی و طاغوتی طاقت ہے جو اسلیے آتی ہے کہ جہل اور باطل اور ظلمت کی مدد کرے اور انسان پر اس کو مسلط کر دے۔ اور

دوسری ہدایت ربانی کی طاقت ہے جو انسانی پیکر میں نمودار ہوتی ہے، تاکہ عقل اور حق اور نور کے پوشیدہ خزانوں کو انسانی فطرت کی تہوں سے نکالے، اور ان سے جہل اور باطل کی تاریکیوں کو دور کردے۔ وہ بھٹکنے والے کا ہاتھ پکڑتی ہے، اسے دلاسا دیتی ہے، اس کے ہاتھوں میں ایک روشنی دیکر صداقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اور جہل و نفس کی کثافتوں سے اس کے دل و دماغ کو پاک کرکے صحیح فہم و بصیرت کا آئینہ بنادیتی ہے۔ یہ پروردگار کی سب سے بڑی نوازش ہے جسے قرآن حکیم نے رحمت و نعمت کہا ہے لیکن جسے اسرائیلی نادانوں نے لعنت کہکر پکارا اور آج کی "مہذب و حکیم" دنیا اس سے بھی زیادہ کہنے کو تیار ہے۔ اسی روشنی کا نام اسلام یا دین الٰہی ہے۔

حق و باطل کے مزاجی تباین کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جہاں انسان نے حق سے باطل کی طرف منہ موڑا، فوراً ہی اسکے دل و دماغ پر جہالت اور خود فراموشی کے پردے پڑنے شروع ہوجاتے ہیں، اور اس سمت میں جتنا جتنا وہ بڑھتا جاتا ہے، اسی رفتار سے وہ صداقت سے بیگانہ، فطرت کے صحیح وجدان سے محروم، حقائق کے ادراک سے عاجز، اور انسانیت کے اعلیٰ و ارفع مقتضیات سے دور ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ اس کے زنگ آلودہ آئینہ میں سچائی اپنا کوئی عکس نہیں ڈال سکتی۔ اُس کی فکر، آب و گل کے حصار میں اس طرح گھر جاتی ہے کہ اُس کے ماوراء کسی شئے کے وجود کا تصور ہی نہیں کرسکتی۔ اس وقت اس کے سامنے اگر علم و حکمت کے فطری نظریات پیش کیے جائیں، رُموز حیات کی شرح بیان کی جائے، اور فلاح و کامرانی کے اصول سکھانے کی کوشش کی جائے تو وہ متحیر ہوکر رہ جائیگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آئیگا کہ اسکے کان کیا سن رہے ہیں۔ وہ اپنی عقل کو ان تصورات سے اس قدر بیگانہ اور نامانوس پائیگا کہ سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھیگا اور چیخنا شروع کردیگا کہ میرے پاس ایسی

باتوں پر غور کرنے کیلیے کوئی وقت نہیں ہے - اس کے نزدیک گویا یہ بدیہی مسئلہ ہوگا کہ اس قسم کی باتیں کرنے والا اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے، سڑی اور دیوانہ ہے۔ یا آسیب زدہ، اور اگر کچھ نہیں تو کم از کم جھوٹا اور مفتری ضرور ہے، شاعرانہ خیالات گھڑ رہا ہے، دام تزویر پھیلا کر دنیا کا شکار کرنا چاہتا ہے -

تاریخ ہدایت اٹھا کر دیکھو، ورق ورق پر یہی داستان لکھی ہوئی ملے گی، اور بالکل ایک ہی سے لفظوں میں - کیونکہ باطل کا مزاج ہمیشہ یکساں رہا ہے، اور حق کی فطرت بھی ہمیشہ غیر متبدل رہی ہے، اس لیے جب جب دونوں میں تصادم ہوا، تصادم کی نوعیت بھی سدا ایک ہی سی رہی -

حضرت نوح علیہ السلام نے جب جہالت کے رنگ کو کھرچنے کی کوشش کی تو باطل پرست انسان بے تاب ہو گیا اور آپے سے باہر ہو کر پتھر مارنے لگا - اسکی سمجھ میں یہی بات نہ آتی تھی کہ اتنی بڑی دنیا کا صرف ایک خدا کیسے ہو سکتا ہے، اور کائنات کی عظیم الشان طاقتیں خدائی سے محروم ہو کر انسان کی معبود بننے کے بجائے اسکی خادم کیسے قرار پا سکتی ہیں - پھر وہ حیران ہو کر کہتا تھا کہ اگر بالفرض خدا ایک ہی ہے، تب بھی ایک انسان کا رسولِ خدا بن جانا کتنی انہونی چیز اور مضحکہ خیز بات ہے اور انسان بھی وہ جس کے پاس چند قلاشوں اور فقیروں کی ایک ناکارہ جماعت کے سوا کوئی طاقت نہیں - کس طرح مان لیا جائے کہ ایسا شخص رب السموات والارض کا فرستادہ اور اس کا سفیر ہو اور اس کے پاس اوپر سے ہدایت آئے -

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ (ہود - ۳) ان کا یہ تعجب اسوقت تک دور نہ ہوا جب تک عذاب الٰہی ان پر برس نہ پڑا اور بعض تو اتنی سرکشی میں تھے

کہ یہ شورِ قیامت بھی انکی آنکھیں نہ کھول سکا۔ اب بھی وہ اللہ کو پہاڑ سے کمتر ہی سمجھتے رہے ہیں۔

قوم نوحؑ کے بعد قوم عادؑ مقام جہل و ضلالت کی وارث ہوئی، اور حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ مقام علم و ہدایت کے جانشین بنکر آئے۔ دونوں طرف پھر وہی نقشہ تھا۔ ادھر سے عقل اور علم کی جو بات بھی کہی جاتی تھی، اُدھر سے اس کا یہی جواب ملتا تھا کہ یہ تو اَن ہونی بات ہے۔ یہ تو کبھی سننے میں نہیں آئی۔ یہ تو کسی طرح سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ ساری کائنات کا ایک خدا! پھر اتنے بڑے خدا سے انسان کا تعلق! پرانے زمانے کے بڑے بڑے آدمی جاہل، اور ہمارے زمانے کا ایک معمولی آدمی علم کی روشنی سے منور! جس شخص کو ہم عام آدمیوں کی طرح کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے دیکھتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ میرے پاس رب السموات والارض کی طرف سے وحی آتی ہے! اور کہتا ہے کہ انسان سب سے حتی کہ سورج اور چاند سے بھی بالاتر اور صرف اللہ سے فروتر ہے! اور کہتا ہے کہ اللہ تک پہنچنے کیلئے کسی سفارشی کی بھی ضرورت نہیں! ان میں سے ایک ایک بات جاہلوں کیلئے نرالی تھی۔ ان کے ذہن ہر بات سے بغاوت کرتے تھے۔ آخرکار انہوں نے فیصلہ کردیا کہ ایسا شخص ضرور دیوانہ ہے۔ إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا۔

حضرت لوط علیہ السلام نے تمدن و معاشرت کی بے اعتدالیوں کی اصلاح کرنی چاہی تو پوری قوم کی قوم اس نئی بات کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاہلوں کی عقل یہ بات سمجھنے سے انکار کرتی تھی کہ جو خواہش عورتوں سے پوری کی جاتی ہے، اسے اگر لڑکوں سے بھی پورا کیا جاسکے، تو اس سے احتراز کیوں کیا جائے۔

مدین کی سرزمین میں بھی عقل و جہل کا نقشۂ جنگ یہی تھا۔ باطل کی محبت اہلِ مدین کے خون میں بری طرح پیوست ہوچکی تھی۔ اُن کے فساد مزاجی کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت شعیبؑ نے آکر انھیں

زندگی کا تریاق پلانا چاہا تو اس کی "تلخی اور سمیت" کی شکایت کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا خدا کو ایک سمجھو، ان بے جان مورتیوں کے سامنے اپنے ماتھے نہ ٹیکو، خدا کی زمین میں فساد برپا نہ کرو، اپنے تمدنی و معاشی نظام کو معائب سے پاک کرو، ناپ تول میں چھل فریب سے کام نہ لو۔ قوم نے جواب دیا یہ نادر فلسفہ کس سے سیکھا ہے؟ کیا ہم اپنے خاندانی اعتقادات اور اپنے تمدن کے پرانے رسم و رواج کو تمہاری نماز پر نثار کر دیں؟ ترازو کی ڈنڈی مار کر جو فائدہ حاصل ہوتا ہے اسے محض اسلیے چھوڑ دیں کہ آخرت میں اس سے نقصان ہوگا؟ آخرت کیلیے دنیا کو قربان کرنا، اور نسیہ پر نقد کو چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ بڑے "حلیم" اور رشید بنکر نکلے ہو!۔ تمہاری نماز اگر توحید و اخلاص اور صفائی معاملات کا حکم دیتی ہے تو تم اس پر عمل کرو، ہمیں کیوں مجبور کرتے ہو کہ اپنا طریقہ چھوڑ دیں۔ مذہب کا معاملہ ذاتی اور انفرادی ہے۔ ساری قوم پر اپنے مزعومات کو مسلط کرنے کا تمہیں کیا حق ہے؟ قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ (ہود - ۸)

پیغمبر نے ان کے اس جاہلانہ تصور کو پھر دور کرنے کی کوشش کی۔ استغفار کی طرف بلایا۔ انجام سے ڈرایا، سنت الہیہ کے اٹل اور سچے اصول پڑھ کر سنائے۔ جواب میں انہوں نے بھی اپنا آخری فیصلہ سنا دیا:

قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ (ہود - ۸)

انہوں نے کہا اے شعیبؑ تمہاری اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہم تو تم کو اپنے اندر بہت کمزور خیال کرتے ہیں۔ اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے۔

کتنی بے باکی اور صاف گوئی سے کہہ رہے ہیں کہ ہم تو تمہاری بات سمجھتے ہی نہیں۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے ساتھ تو قدم قدم پر اس جہالت اور کج فہمی نے ٹکرلی۔ فرعونی گروہ نے توحید و معاد کا "نو ایجاد" نام سنا تو کہنے لگا۔

مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ۔ (قصص ۴) یہ تو محض گھڑا ہوا جادو (ساحرانہ ڈھکوسلا) ہے، ہم نے تو اپنے بزرگوں میں ایسی بات کبھی سنی ہی نہیں۔

لیکن یہ تو تھے ہی پروردۂ جہل و ظلمت۔ تفرعن اور حب نفس کے غلیظ پردے تو ان کے تخیلات پر پوری طرح چھا ہی چکے تھے۔ پر جنکے قلوب رحمت کے چشموں سے بار بار دھوئے جا چکے تھے اور جنکی فطرت کو جگانے اور عقل کو جلا دینے کیلیے صیقل گر ازل نے پے بہ پے مواقع بہم پہنچائے تھے، ان سے بھی جب ایک، اکیلے، ان دیکھے اور غیر جسمانی معبود کی پرستش کیلیے کہا گیا تو ان کا تصور اس غیر مانوس حقیقت کو اپنی گرفت میں نہ لے سکا، صبر نہ کر سکے اور پیغمبر سے کھل کر کہہ ہی دیا کہ:

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً ہم تمہاری بات ہرگز نہ مانیں گے تا آنکہ اللہ کو علی الاعلان دیکھ لیں۔

آگے چل کر ایک موقعہ پر تو اس جہل پرست ذہنیت نے کمال ہی کر دیا۔ فرعون اور اس کے طاغوتی لشکر کو دریا کی موجیں نگل چکی ہیں۔ قوم یہود آسمانی رحمتوں کے سایہ میں ارض مبارکہ کی طرف ہجرت کر رہی ہے۔ راہ میں ایک قوم نظر آتی ہے جو تراشے ہوئے مجسموں کو سجدے کر رہی ہے۔ اِس جانی پہچانی عبادت کا پرانا نقش محبت یکایک ابھر آتا ہے اور وہ حضرت موسیٰ سے کہتے ہیں :-

یَامُوسَی اجْعَل لَّنَا إِلٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ — اے موسیٰ جیسے ان کے خدا ہیں ویسا ہی ایک خدا ہمارے لیے بھی بنا دے۔

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا۔

إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ — تم تو نرے جاہل لوگ ہو۔

"جاہل" قوم ہو، یعنی تمہارے دل و دماغ پر جذبات نفس اور بے عقلی کی کارفرمائی ہے جو خالص... فطری نظریات سے مانوس نہیں ہونے دیتی۔

یہ عہدِ عتیق کی چند سچی شہادتیں ہیں۔ ان اجمالی اشارات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علم و معرفت، تہذیب و تمدن، معاشرت و سیاست، اخلاق و اعتقاد کے بلند اصول جو انسانی عقل اور روح کی مرغوب ترین غذا ہیں، خود انسان ہی کا ذوق کسی وقت میں ـــ انھیں کتنی ترشروئی اور ناگواری کے ساتھ اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ اس کی وجہ، ہر زمانہ میں، ہر جگہ اور ہر قوم کیلیے ہمیشہ ایک ہی رہی ہے یعنی انسانی ذہنیت کا پست اور اس کی فکری و عقلی صلاحیتوں کا مجروح و فاسد ہو جانا۔ یہی ایک مستقل حجاب ہے جو حق و باطل کے درمیان ہمیشہ حائل ہوتا رہا ہے۔

شائد یہ شبہ ہو کہ یہ اُس دور کے حالات ہیں جب عقلِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت سے گذر رہی تھی۔ وہ اتنی اونچائی تک پہنچنے سے خِلقاً عاجز و بے بس تھی۔ لیکن نہیں، بات یہ نہیں ہے۔ اُس "عہدِ طفلی" میں بھی جنکی فطرتیں پاک اور بے آمیز تھیں، مقام انسانیت کی قدرشناس تھیں، ان کے سامنے جب حق نمودار ہوا تو پکار اٹھے وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ٥ حق سے وحشت کھائی، اس پر استعجاب ظاہر کیا تو محض ان کور دماغوں نے جو دنیا پر مفتون تھے، محسوسات و مادّیات کے غلام تھے، اپنی اہوا و آرا کو اپنا معبود بنا چکے تھے، جو انسانیت اور نفسانیت کو مترادف سمجھنے لگے تھے، جنکی عقلیں تاریک اور

فطرتیں مسخ ہو چکی تھیں۔

چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ جب شعور انسانی اپنے کامل نشو و نما کو پہنچ چکا، عقلیں پختہ اور نظریں وسیع ہو چکیں، امانت الٰہی کو پوری ذمہ داری کے ساتھ اٹھانیکا وقت آیا، اُسوقت بھی یہ سنت بالکل اسی لباس میں نمودار ہو کر رہی، اور پیغمبر آخر الزماںؐ کی بلند تعلیمات کو اسی حیرت اور استعجاب کے ساتھ سُنا گیا۔ آپ کی صدائے حق کانوں کو اسی طرح اجنبی، غیر مانوس اور ناقابلِ فہم معلوم ہوئی، اور آپ کو اسی طرح شاعر، مجنون، کاہن، مفتری اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا اور جب قوم نے رحمت و خیر خواہی کا جواب پتھروں اور ننگی تلواروں سے دیا، تو پیغمبرؐ کی زبان سے بھی صرف یہی نکلا کہ رَبِّ اِهْدِ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔ یعنی خدایا! یہ قوم مجھے ابھی سمجھ نہیں رہی ہے، تو ان سے درگذر کر اور ان پر راہِ حقیقت باز کر دے۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ نہ صرف سچائی مظلوم تھی اور حق فراموش ہو چکا تھا، بلکہ نفس اور جہل کی فریب کاریوں نے صداقت اور ہدایت کا معیار بھی بدل ڈالا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ "دولت" اور "ہدایت" دو توام حقیقتیں ہیں۔ جو جتنا بڑا صاحب مال و اقتدار ہے، اتنا ہی بڑا راستی کا حق شناس اور رحمت الٰہی کا مستحق ہے۔ کس مپرسی اور ناداری کا مفہوم سوا اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ جس کے حصہ میں آئے، وہ اللہ کی رحمت و نوازش کا سرے سے استحقاق ہی نہیں رکھتا۔ اس نظریہ کی بنا پر وہ کہتے تھے کہ ایسا شخص اللہ کی ہدایت کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے جو یتیم، مفلس اور بے یار و مددگار ہو۔ گویا اس وقت بھی دنیوی وجاہت اور تمکن فی الارض کو اللہ کی محبوبیت اور راستی و ہدایت کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔

یہی وہ جاہلانہ تصور تھا جو قرآنی آیات و بینات پر غور کرنے سے انھیں بے نیاز کیے

ہوئے تھا، اور وہ بجائے اسکے کہ صداقت کو صداقت کی حیثیت سے جانچتے اور اسے اخلاق وحسن فطرت کی تجلی گاہوں میں ڈھونڈھتے، اسے سیم و زر کے ڈھیروں میں تلاش کرنے لگے۔ وہ رسول کے دعوائے رسالت کو اس بنا پر محل تعجب سمجھتے کہ بفرض محال اگر خدا کسی فرشتہ کے بجائے ایک بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجنے والا ہوتا، تو چاہیے تھا کہ وہ زر و جواہر سے لدا ہوتا اور عیش وتنعم کے پر بہار باغات ساتھ لیکر آتا۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا فرستادہ، اس کا پیغمبر، برگزیدہ اور چہیتا، اس خستگی اور بے سرو سامانی کی حالت میں ہو، غلاموں اور معمولی انسانوں کی طرح بازاروں میں پھرتا ہو، سارے عالم کی رحمت ہونے کا دعویٰ اور خود اپنی یہ کیفیت! اگر انسان ہی کو رسول بنتا تھا تو مکہ یا طائف کا کوئی بڑا سردار بنتا۔ فاقے کرنے اور پیوند لگانے والا کیسے رسول بن سکتا ہے۔ چنانچہ جب وہ آپ کو دیکھتے تو طنز کے انداز میں کہتے:

أَهٰذَا الَّذِي يَذْكُرُ آلِهَتَكُمْ کیا یہی وہ (بزرگ) ہیں جو تمہارے معبودوں کی تحقیر کرتے ہیں۔

پھر جب وہ پیغمبرؐ سے نظر ہٹا کر اُس کے متبعین کو دیکھتے تو تعجب، تحیر سے بدل جاتا اور انکی بے نوائی سے پوچھتے:

أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا۔ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ کیا یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہماری قوم میں سے چُن کر اپنی نوازشوں کیلیے مخصوص فرمایا ہے؟ کیا اللہ اپنے شکر گذار بندوں کے حال سے بھی واقف نہیں؟

یہ انکار و تعجب تو مورد ہدایت پر تھا۔ مگر خود ہدایت اور اس کے اصول اور اسکی تعلیمات پر وہ اس سے بھی زیادہ اجنبیت اور حیرت کا اظہار کرتے۔

دین فطرت کے داعی نے جب انھیں خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش سے منع کیا، تو ل

کو بے جان و بے اختیار ٹھیرایا اور توحید کی دعوت دی تو قوم نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کہ تم ایسی نرالی بات کہتے ہو جسے دنیا نے اپنی اتنی لمبی عمر کے باوجود اب تک نہ سنا تھا اَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ...... مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ ۔ کیا اس شخص نے تمام خداؤں کو ایک خدا بنا دیا؟ یہ عجیب بات ہے! ہم نے تو ایسی بات پہلے لوگوں سے کبھی نہیں سنی ۔ یہ محض ایک گھڑی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے ۔

رسول اللہ صلعم نے جب انھیں تخلیق کائنات کی حکمت بتانی چاہی، جزا و سزا کا ناگزیر قانون ــــ جسکے اعتقاد پر ساری نیکیوں کا انحصار ہے ــــ پڑھکر سنایا، بعث بعد الموت کا فلسفہ بیان کیا، تو جواب ملا، تمہاری مجنونیت کی حد ہو گئی، جس جسم کے ذرے ہوا کی لامحدود وسعتوں میں منتشر ہو جائیں، زمین کے تاریک گوشوں میں دب کر رہ جائیں، ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو چکی ہوں، اس کا از سر نو جسم و جان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا کتنی عجیب بات ہے! ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۔

پھر جب وہ دیکھتے کہ انہی جیسا ایک انسان اپنے آپ کو اللہ کا فرستادہ کہتا ہے، اور بیان کرتا ہے کہ رب السموات والارض کے پاس سے اسکو ہدایت مل رہی ہے تو ان کا دماغ فرط تعجب سے ماؤف ہو جاتا ۔ وہ حیران ہو کر کہتے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ ایک شخص کہتا ہے کہ میں خدا کے پاس سے پیغام لایا ہوں، اور پیغام یہ سناتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے :۔

بَلْ عَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُونَ هٰذَا — انھیں تعجب ہوا کہ انھیں میں سے ایک ڈرانیوالا (اللہ کا فرستادہ) آیا ہے ۔ پھر کافروں نے کہا کہ اس کا

شَیْءٌ عَجِیْبٌ ءَاِذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا دعویٰ تو اور بھی عجیب ہے، کیا مر کر خاک ہو جانے
ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِیْدٌ (ق - ۱) کے بعد ہم پھر زندہ ہو کر اٹھیں گے؟ یہ واپسی
تو بالکل بعید از عقل ہے -

پیغمبر نے ان تینوں اصولی تعلیمات توحید، معاد اور نبوت پر خدا کی ارضی و سماوی بے شمار نشانیوں سے استدلال کیا - عام قوانین فطرت سے انکے استعجاب کو دور کرنا چاہا - صحیفۂ کائنات کی نمایاں حکمتوں کو پڑھکر سنایا - انھیں بار بار غور و فکر کی دعوت دی، اور آخر میں کہا، بتلاؤ تم خدا کے کن کن کرشموں کا انکار کروگے اور فطرت آفاق و انفس کے کن کن دلائل و آثار سے آنکھیں بند کروگے؟ لیکن ان تغافل کیشوں نے سب کا ایک ہی جواب دیا:-

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْ اَکِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَا اور ان کافروں نے کہا کہ جس چیز کی طرف تم
اِلَیْهِ وَفِیْ آذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْ بَیْنِنَا وَ ہمیں بلاتے ہو اسکے لیے تو ہمارے دل پردے
بَیْنِكَ حِجَابٌ - (حٰمٓ سجدہ - ۱) میں ہیں، ہمارے کانوں میں گرانی ہے، اور
ہمارے تمہارے مابین ایک حجاب پڑا ہوا ہے -

اور ان کا یہ جواب کچھ غلط بھی نہ تھا - قرآن نے بھی اس کی تصدیق کی - مگر فرق یہ ہے کہ وہ طعن و تمسخر کے پردے میں کہہ رہے تھے، قرآن نے اس پردہ کو اٹھا کر حقیقت حال کی عریاں تصویر پیش کر دی:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ وہ دل رکھتے ہیں مگر اس سے سوچتے نہیں،
اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ وہ آنکھیں بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں
آذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ ان کے پاس کان بھی ہیں پر وہ ان سے سنتے نہیں - یہ تو
كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (اعراف - ۲۲) جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بدعقل او گمراہ

آخر یہ دل رکھتے ہوئے نہ سوچنے، کان رکھتے ہوئے نہ سننے اور آنکھیں رکھتے ہوئے نہ دیکھنے کا مطلب کیا ہے؟ یہ محض زجر و توبیخ نہیں ہے، بلکہ ایک حقیقت کا بے کم و کاست اظہار ہے۔ دراصل اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیمات اور کفار کے مذاق میں بُعد المشرقین ہے۔ قرآن میں مظنونات اور قیاسات نہیں ہیں بلکہ خالص علم ہے۔ وہ حقائق اشیاء کو، جیسی کہ وہ ہیں، ہو بہو دیکھتا ہے اور آثار فطرت کی شہادت سے انسان کو ان تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ خواہشات کے بجائے عقل، اور نفس حیوانی کے بجائے فطرت انسانی کو براہ راست خطاب کرتا ہے۔ اس نے اخلاق اور معاملات کے جس قدر اصول و قوانین بیان کیے ہیں ان میں بھی خالص عقلیت اور بے آمیز فطرتیت ہے۔ اس کو سمجھنے اور اس کی پوری پوری قدر کرنے کیلیے ایسی عقل کی ضرورت ہے جو خواہشاتِ نفس کی بندگی اور روایت پرستی سے آزاد ہو کر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ایسی بے رنگ نگاہ کی ضرورت ہے جس پر ظنون اور قیاسات اور رجحانات نفس کی رنگین عینکیں چڑھی ہوئی نہ ہوں۔ ایسی صحیح فطرت کی ضرورت ہے جس کو نفس حیوانی کی دست بُرد نے یا آباو اجداد کی اندھی تقلید نے، یا ماحول کے بُرے اثرات نے، یا قیاسی علوم کی خامیوں نے اتنا مجروح نہ کر دیا ہو کہ وہ ان بندشوں سے آزاد ہو کر کسی سچی اور حقیقی بات کو قبول ہی نہ کر سکتی ہو۔ جاہلیت کی آغوش میں جو لوگ صدیوں سے پرورش پا رہے ہوں وہ ان صفات سے عاری ہوتے ہیں۔ رسوم اور خواہشات کی غلامی سے نہ انکی عقل آزاد، نہ نظر آزاد، نہ فطرت آزاد۔ وہ صرف ایسی تعلیم مانگتے ہیں جو انکے ظنون و اوہام، انکی رسوم پرستی، اور انکی خواہشات نفس کے مطابق ہو۔ مگر قرآن انکے سامنے خالص عقل اور خالص علم اور خالص فطرت کی باتیں پیش کرتا ہے۔ اسلیے اسکی ہر ہر بات کو سُن کر وہ کان کھڑے کرتے ہیں۔ ہر چیز کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو نرالی

چیز ہے - ہماری تو سمجھ ہی میں نہیں آتی - ہمارے لیے تو یہ بالکل اجنبی اور نامانوس چیز ہے -

اسی لیے قرآن مجید بار بار کہتا ہے کہ جہالت اور ہوا پرستی (جسے وہ اپنی زبان میں فسق اور ظلم سے تعبیر کرتا ہے) کا غلاف جس آنکھ پر پڑا ہو وہ میری ہدایت کی روشنی نہیں دیکھ سکتا اور نہ اس سے بہرہ ور ہو سکتا ہے، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ (الصف - ۱)

یہ روشنی صرف اسکو مل سکتی ہے جو فطرت سلیمہ کی خالص بصیرت سے پوری توجہ و انابت اور حضوری قلب کے ساتھ اسے ڈھونڈھے - اِنَّ فِي ذَالِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (قٓ - ۳) ایک جگہ پوری طرح حصر کے ساتھ فرمادیا ہے کہ صرف عقل رکھنے والے ہی نصیحت پذیر ہو سکتے ہیں اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (رعد - ۳)

ہدایت کا یہی فلسفہ آیتِ ذیل میں بیان ہوا ہے :-

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ - (بقرہ - ۳)

اسی قرآن کے ذریعہ خدا بہتوں کو گمراہ کرتا اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے، اور اس سے گمراہ صرف انہی لوگوں کو کرتا ہے جو فاسق ہیں -

اور ہدایت کیلیے ضرورت کس چیز کی ہے؟ محض عقلِ سلیم اور فطرت صحیحہ کی اور محض صداقت کی حقیقی طلب کی - چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے دلائل کی تفصیل کرنیکے بعد فرماتا ہے :-

اِنَّ فِيْ ذَالِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى (طٰہٰ - ۷)

ان کے اندر عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں -

اور :-

ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ

یہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کی کوئی بات نہیں ہے -

یہ ہدایت ہے متقیوں کیلیے۔

"ھُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کے دو لفظوں میں اسرار ہدایت کی پوری داستان سمیٹ دی گئی ہے جسکے اندر حقائق کا ایک پورا خزانہ پوشیدہ ہے۔ تقویٰ کہتے ہیں روح انسانی کی حمایت اور نفس حیوانی وجذبات پرستی کی مخالفت کو، اور اسلام کا دنیا سے اس کے سوا کوئی مطالبہ نہیں کہ وہ اپنی عقل اور اپنی انسانی فطرت کو ہوئی سے پاک کرے، اور اسکو قبول صداقت کیلیے صالح بنالے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس) — اور قسم ہے نفس کی اور اسکی جس نے اسکا توازن درست کرکے بدکاری اور تقویٰ دونوں کی سمجھ اسے دیدی، کہ کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کو پاک کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے خواہشات سے مغلوب کردیا۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (النازعات) — اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو ہوئی سے روکا اس کا ٹھکانا جنت ہے۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (الزمر۴) — جو سچی بات لیکر آیا اور جس نے سچی بات کو قبول کیا بس وہی متقی ہیں۔

قرآن کے فہم وادراک اور اسکی صداقت کو قبول کرنے میں اپنی صفات کا فقدان مانع ہوتا ہے۔ اسلیے قرآن کہتا ہے کہ جن لوگوں میں تقویٰ نہیں ہے، جن کے اندر قبولِ صداقت کا اندرونی رجحان ہی نہیں ہے ان کے لیے میں ہدایت نہیں ہوں، بلکہ ان کے لیے مزید گمراہی کا سبب بن جاتا ہوں، کیونکہ وہ ضد اور شقاق کے ساتھ جتنا جتنا مجھ سے بُعد اختیار

کرینگے اتنے ہی گمراہ ہوتے چلے جائینگے۔

اسی لیے یہ کتاب بار بار انسان کی عقل اور اسکی فطری سمجھ بوجھ سے اپیل کرتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ اپنی فکر و نظر کو جاہلیت کے پردوں سے نکال کر میری آیات پر غور کر:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد ۳) کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا انکے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں۔

پھر اسی عتاب کو یوں ظاہر کیا جاتا ہے:-

وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (انعام ۴) دنیا کی زندگی محض کھیل کود ہے، دار آخرت (کی نعمتیں) تقویٰ اختیار کرنیوالوں کیلیے بہتر ہیں کیا تم سوچتے نہیں۔

حتی کہ جس روز اس جہالت کا سارا طلسم حیرت ٹوٹ جائیگا اس روز بھی ان پر یہی جرم اور انہیں الفاظ کے ساتھ عائد کیا جائیگا۔

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْکُمْ جِبِلًّا کَثِیْرًا اَفَلَمْ تَکُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ (یٰسین ۴) اور شیطان نے تم میں سے ایک بڑے گروہ کو گمراہ کر دیا، کیا تم (اسوقت دنیا میں) عقل سے کام نہیں لے رہے تھے۔

اس وقت انکی آنکھوں سے پردے ہٹ چکے ہونگے اور انھیں خود حسرت ہوگی تو صرف یہی کہ:-

لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (ملک ۱) اگر ہم (دنیا میں) سنتے اور سمجھتے ہوتے تو آج دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

خدا کی سنت عقل کو چھوڑ کر کسی اور چیز کو میان بحث میں لانی ہی نہیں۔ پیغمبر جب

کفار کی ناعاقبت اندیشی اور ان کے انکار وجحود پر اپنی شفقتوں کی وجہ سے ملول ہوتا ہے
اور اسکی نگاہیں اوپر اٹھتی ہیں کہ کاش اللہ کوئی صورت ان کے ایمان لانیکی پیدا کردے، اور
معجزات دکھا کر انھیں مطمئن کردے، تو خدا کا وہ قانون جو صرف عقل وتذکّر کو درخورِ اعتنا
سمجھتا ہے، پیغمبر کے اس ہمدردانہ جذبہ پر تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ
الْجَاهِلِينَ (انعام - ۴) یعنی اے پیغمبر تم جاہلوں کی سی روش مت اختیار کرو۔ غور کرو پیغمبر کا
جذبہ کتنا بلند، صالح اور پاکیزہ ہے، مگر کن الفاظ میں اس کو متنبہ کیا جارہا ہے۔ اُس سے
کہا جاتا ہے کہ تم عقل اور جاہلیت کی اس جنگ میں اپنی خواہش کو درمیان نہ لاؤ، کیونکہ
تمہاری خواہش پاکیزہ ہی سہی، مگر ہے تو جانب مخالف کی چیز!

یہ ہیں قرآنی تعلیمات اور اصول ہدایت۔ اب دیکھو کہ اس کے منکرین کا حال، ان کا
قائم کردہ معیار ہدایت، اور ان کا نظریۂ حیات کیا تھا؟ اس کا جواب تاریخ سے پوچھو جو تمھیں
بتائیگی کہ ان کے جیب ودامن میں جاہلیت کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ عقل وفطرت کے مقتضیات
مجروح بلکہ مدفون ہو چکے تھے۔ انھیں اپنے مناصب سے معزول کرکے نفس حیوانی کی چاکری
پر لگا دیا گیا تھا۔ نفس، جذبات حیوانی کی تسکین کا جو طریقہ ایجاد کرتا، عقل کیلیے ضروری تھا
کہ اس کو معقولیت، علم، اور مذہبی تقدس کے خوشنما لباس پہنائے، اسکے لیے جواز کے
دلائل فراہم کرے اور اسکو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے وسائل ایجاد کرے۔
شراب خوری، قمار بازی، سود، قتل اولاد، عریانی اور فحش کاری پر کہیں ادب لطیف کا
اور کہیں آرٹ کا، اور کہیں مذہبی تقدس کا، اور کہیں معاشی فلاح وبہبود کا، اور کہیں اخلاقی جواز
کا خوشنما غلاف چڑھایا گیا تھا۔ انسانی فطرت اتنی دب گئی تھی کہ وہ ان کے خلاف بغاوت
کا خیال بھی دل میں نہ لاسکتی تھی۔ مال وزر کی کثرت خدا کے ہاں مقبول ہونیکی سند مانی

جاتی تھی- باپ دادا کا طریقہ خدا کا تسلیم کردہ طریقہ مانا جاتا تھا۔ محسوسات کی پرستش کے وہ اتنے خوگر ہو چکے تھے کہ اس کے علاوہ کسی طریقۂ عبادت کا تصور ہی ناممکن ہو گیا تھا۔ غرض علمی و اعتقادی اور عملی دونوں حیثیتوں سے وہ عقل کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ آزادانہ غور و فکر ان کی شریعت میں سب سے بڑا جرم تھا، دین و دنیا کے تمام معاملات کا فیصلہ کرنے والا ان کا نفس حیوانی تھا۔ بصیرت کی آنکھیں پھوٹ چکی تھیں۔ قلب کی صلاحیتیں مسخ ہو چکی تھیں۔ تدبر کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ انکی ساری جدوجہد اپنے غیر عقلی میلانات کی تکمیل میں صرف ہو رہی تھی۔ دنیا ان کی معبود بن چکی تھی۔ محسوسات پرستی انکے فکری اور مذہبی کمال کی آخری معراج تھی۔ یعنی انھیں "حیوان" بننے پر فخر تھا۔ وہ اس تاریکی میں تھے جسکو کوئی روشنی دور نہیں کر سکتی تھی۔ ان کی اسی حالت کو قرآن کبھی اس طرح تعبیر کرتا ہے کہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے (تطفیف - ۱) - کبھی کہتا ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے (بقرہ - ۱)

اب دونوں چیزوں ——— قرآن کی دعوت اور منکرین کی ذہنی صلاحیت اور دماغی کیفیت ——— کو بالمقابل رکھ کر دیکھو کہ قرآنی تعلیمات سے یہ انکار، یہ تمرد، یہ تعجب، یہ استہزاء اور استنکاف کس بنیاد پر تھا۔ تمہیں صاف نظر آئیگا کہ بس ایک ہی چیز تھی جو دونوں کے درمیان حائل تھی، یعنی جہالت، نفس پرستی، آباء پرستی، ماضی پرستی اور محسوسات پرستی۔ ظاہر ہے نقیضین کا اجتماع کسطرح ممکن ہے۔ اس تباینی کیفیت میں جبکہ ایک کی بنیاد عقل و فطرت پر ہو اور دوسرے کی نفس حیوانی اور جہالت پر، ایک کی ابجد غور و فکر سے ہو اور دوسرے کی ابتدا ذبح فطرت اور قتل انسانیت پر، ایک کا قدم اول عرش پر پڑے اور دوسرے کا کعبۂ مقصود پیٹ یا شہوت ہو، ایسی حالت میں دونوں کا مصالحت کر لینا اور باہم گلے مل جانا اتنا ہی زیادہ ناممکن ہے جتنا حق کا باطل یا باطل کا حق ہو جانا۔ جن کا حال یہ ہو

کہ وہ اوپر سے انسان اور اندر سے بہائم ہوں بلکہ جہالت اور ہوس رانی کی دوڑ میں
بہائم سے بھی آگے نکل گئے ہوں وہ اُس دعوت کو سمجھتے تو کیسے اور قبول کرتے تو کسطرح
جس کو جہل اور رسوم پرستی اور اندھی تقلید اور بندگی نفس سے ازلی بیر ہے۔ اگر وہ حق
سے نہ بدکتے، اُس سے وحشت نہ کھاتے، اس سے بیگانگت اور اجنبیت نہ محسوس
کرتے تو مقام تعجب تھا۔ (باقی)

تنزیل و تاویل

تفسیر آیۃ:

ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا ..... من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر الخ

(۲)

اس قاعدۂ کلیہ کے تحت یہ آپ سے آپ لازم آجاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کی بھی تصدیق کی جائے، کیونکہ اگر کوئی شخص تمام انبیاء پر ایمان لائے، اور صرف آنحضرتؐ پر ایمان لانے سے انکار کرے، یا تمام کتب آسمانی کو مانے اور صرف قرآن کو نہ مانے، تو درحقیقت وہ تمام انبیاء اور تمام کتب آسمانی، بلکہ اصل دین الٰہی کا منکر ہوگا، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اس بات کی تصریح قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں، بیشمار مقامات پر کی گئی ہے، اور اسی بنا پر انبیائے سابقین اور کتب سابقہ کے ماننے والوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور ان سے صاف صاف کہا گیا ہے کہ اگر تم ان پر ایمان نہ لاؤ گے تو کفر کے مجرم ہو گے، ہ

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ
مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ
يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا
فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ

اور جب خدا کی طرف سے ان کے پاس وہ کتاب آئی جو انہی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو انکے پاس پہلے سے موجود تھیں، تو باوجودیکہ وہ اس کتاب کی آمد سے پہلے کفار کے مقابلے میں اسی کتاب کی توقع پر فتح کی

فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ...... وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (البقرہ - ۱۱)

دعائیں کرتے تھے، مگر اسکے آنے پر انہوں نے اس سے انکار کر دیا، حالانکہ وہ اسے خوب پہچانتے تھے پس خدا کی لعنت ہو ان کافروں پر ...... اور جب ان سے کہا گیا کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو خدا نے بھیجی ہے تو انہوں نے کہا کہ ہم تو صرف اسی کو مانینگے جو ہمارے پاس آئی ہے۔ اس کے سوا دوسری کتاب کو ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ..... اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ (آل عمران - ۱)

اللہ نے تم پر یہ کتاب برحق اتاری ہے۔ یہ تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے آچکی ہیں...... بے شک جو لوگ خدا کی آیتوں کے منکر ہیں انکے لیے سخت عذاب ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ (النساء - ۷)

اے اہل کتاب! ایمان لے آؤ اُس کتاب پر جو ہم نے اتاری ہے اور جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود ہیں، قبل اسکے کہ ہم چہروں کو بگاڑ کر الٹا دیں یا ان کو اسطرح لعنت زدہ کر دیں جسطرح ہم نے اصحاب سبت کو لعنت زدہ کیا۔

ان سے بھی زیادہ صاف الفاظ میں وہ آیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ

اور اہل کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ضرور ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس کتاب پر

مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ ...... اُولٰٓئِكَ جو تمہاری طرف بھیجی گئی اور ان کتابوں پر جو
لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (آل عمران-۲۰) انکی طرف بھیجی جا چکی تھیں ..... ایسے لوگوں
کے لیے ان کے پروردگار کے ہاں اجر ہے -

یہ آیت نہایت واضح طور پر آیت زیر بحث کی تفسیر کر رہی ہے - وہاں کہا گیا تھا کہ مسلمان، یہودی، عیسائی، صابی، ان میں سے جو کوئی اللہ اور آخرت پر ایمان لائیگا وہ اس کا اجر اپنے پروردگار کے ہاں پائیگا - یہاں اسکی تفسیر اس طرح کر دی گئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے آجانے کے بعد صرف وہی اہل کتاب خدا کے ہاں اجر پا سکینگے جو اللہ پر اور اسکی بھیجی ہوئی پچھلی کتابوں پر ایمان لانے کے ساتھ اس کتاب پر بھی ایمان لائیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی ہے - اس سے زیادہ کھلی ہوئی تفسیر اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس کے باوجود جو شخص آیت زیر بحث سے یہ معنی نکالتا ہے کہ یہودی کا بس یہودی بن جانا اور عیسائی کا محض سچا عیسائی بن جانا، قرآن کی نظر میں ہدایت یافتہ اور مستحق اجر ہونے کے لیے کافی ہے، وہ خود قرآن کے صریح بیانات کے خلاف قرآن کی تفسیر کرتا ہے - یہ سچ ہے کہ قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کو تورات اور انجیل کے اتباع کی دعوت دیتا ہے، مگر یہ بھی خبر ہے کہ اس دعوت کے معنی کیا ہیں؟ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہود و نصارٰی، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر توراۃ و انجیل کا اتباع کریں، بلکہ اسکا مطلب در اصل یہ ہے کہ توراۃ و انجیل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے پیغام کی پیروی کرنے کے لیے جو ہدایات دی گئی تھیں ان کا اتباع کیا جائے، چنانچہ قرآن میں صاف کہدیا گیا ہے کہ اب توراۃ و انجیل کا حقیقی اتباع، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے :-

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ (المائدہ -) اے اہل کتاب تمہارا دعوائے حق پرستی بیچ ہے جب تک کہ تم توراۃ اور انجیل اور اس کتاب کی پیروی پر قائم نہ ہو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ...... أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (الاعراف - ۱۹) جو لوگ اس پیغمبر نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر انہیں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے...... وہی درحقیقت فلاح پانیوالے ہیں۔

یہ صرف اسی بنا پر نہیں ہے کہ قرآن اُسی تعلیم خداوندی کو پیش کرتا ہے جسکو توراۃ اور انجیل پیش کرتی تھیں، بلکہ یہ اس وجہ سے بھی ناگزیر ہے کہ قرآن اُس تعلیم ہدایت کا جدید ترین (Latest) بلکہ آخری ایڈیشن (Last edition) ہے۔ اس میں بہت سی اُن چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھیں، اور بہت سی وہ چیزیں حذف کردی گئی ہیں جنکی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔ لہذا جو شخص اس ایڈیشن کو قبول نہ کرے گا وہ صرف خدا کی نافرمانی ہی کا مرتکب نہ ہوگا بلکہ ان فوائد سے بھی محروم رہ جائیگا جو آخری اور جدید ترین ایڈیشن میں انسان کو عطا کیے گئے ہیں:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ (المائدہ - ۳) اے اہل کتاب، تمہارے پاس ہمارا پیغمبر آگیا ہے جو تم کو کتاب الٰہی کی بہت سی وہ باتیں کھول کر بتاتا ہے جن کو تم چھپاتے ہو، اور بہت سی

چیزوں سے معاف بھی کر دیتا ہے۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف - ۱۹)

اور وہ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بھاری بوجھ اور وہ طوق و سلاسل اتار دیتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے۔

نیز یہ اسلیے بھی ضروری ہے کہ اہل کتاب نے خدا کی پچھلی کتابوں میں قصداً تحریف کی، اور بہت سی چیزوں کو بھلا دیا، اور بعض کتابوں (مثلاً اصلی منزل من اللہ انجیل) کو کھو دیا، جسکی وجہ سے اب یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص اتباع قرآن کے بغیر موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور توراۃ و انجیل کا حقیقی اتباع کر سکے:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ...... وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (المائدہ - ۳)

یہودی الفاظ کو ان کے اصل معنوں سے پھیر دیتے ہیں، اور انہوں نے ان ہدایتوں کا ایک بڑا حصہ بھلا دیا جو ان کو دی گئی تھیں ...... اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں ان سے ہم نے عہد لیا تھا مگر انہوں نے بھی ان ہدایات کا ایک حصہ بھلا دیا جو ان کو دی گئی تھیں۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جن قوموں کے متعلق خود قرآن نے تصدیق کی ہے کہ ان کو خدا کی طرف سے کتاب دی گئی تھی، ان کیلیے بھی جب اتباع قرآن کے سوا ہدایت کا کوئی راستہ نہیں ہے، تو پھر ان قوموں کو اتباع قرآن کے بغیر ہدایت کا راستہ کیسے مل سکتا ہے جن کا اہل کتاب ہونا محض قاعدہ کلیہ لکل قوم ھاد کی بنا پر فرض کر لیا گیا ہے۔

بظاہر یہ کہنے میں بڑی رواداری نظر آتی ہے کہ "اسلام صرف اپنے آپ ہی کو برحق نہیں کہتا بلکہ دوسرے مذاہب کو بھی سچا سمجھتا ہے، اور اسکا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ لوگ جب تک اپنے اپنے مذہبوں کو چھوڑ کر اسلام نہ لے آئیں، ہدایت اور نجات سے بہرہ یاب نہ ہونگے، بلکہ وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ اپنے اپنے مذہبوں کی اصلی تعلیمات کا اتباع کرو" ــــ لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ سراسر ایک غیر معقول بات ہے۔ دو نقطوں کے درمیان جس طرح خط مستقیم ایک ہی ہوسکتا ہے، اسی طرح انسان سے خدا تک صراط مستقیم بھی ایک ہی ہوسکتی ہے۔ اسلام جب اپنے آپ کو صراط مستقیم کہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ لازم آجاتا ہے کہ اس کے سوا جتنے راستے ہیں وہ ان سب کو غلط اور ٹیڑھے راستے قرار دے۔ کسی راستہ کو صراط مستقیم بھی کہنا اور پھر مختلف راستوں کو راہ راست بھی قرار دینا، کسی صاحب عقل کا کام نہیں ہے۔ یہ اگر رواداری ہے تو محض ایک جھوٹی رواداری ہے، اور قرآن ایسی رواداری سے صاف انکار کرتا ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا	اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے، لہذا تم اسی
فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ	پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو
فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ	خدا کی راہ سے بھٹکا دینگے۔ یہ ہدایت ہے جو خدا نے
وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الانعام-۱۹)	تم کو دی ہے شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

رواداری جتنی مستحسن چیز ہے، اس سے بدرجہا زیادہ غیر مستحسن چیز جھوٹ ہے۔ جس شخص کو اس معاملہ میں اپنی رواداری کا مظاہرہ کرنا ہو وہ اپنی طرف سے ایسی بات کہہ سکتا ہے، مگر اسے قرآن کی طرف سے وہ بات کہنے کا کیا حق ہے جو اس نے نہیں کہی، بلکہ جس کے خلاف وہ علی الاعلان کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی پیروی کے سوا کوئی راستہ

بھی صحیح راستہ نہیں ہے۔ تمام نوع انسانی کیلیے اور ہمیشہ کیلیے اب یہی ایک راستہ ہدایت اور نجات کا راستہ ہے۔ جو اس کو اختیار نہ کرے گا اس کا انجام دنیا میں گمراہی اور آخرت میں خسران کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف - ۲۰)	کہدو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔
وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ (الانعام - ۲)	اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ تمکو اور ان سب لوگوں کو خبردار کروں جن تک یہ پہنچے۔
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (السبا - ۳)	اور اے محمدؐ! ہم نے تمکو تمام ہی انسانوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا بناکر بھیجا ہے۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (البقرہ - ۲۵)	اے انسانو! تم سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے راستوں پر نہ چلو۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ وَإِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (النساء - ۲۳)	اے انسانو! یہ رسول تمہارے پاس خدا کی طرف سے حق کیساتھ آیا ہے۔ ایمان لاؤ کہ اسی میں تمہارے لیے بھلائی ہے۔ اور اگر کفر کروگے تو جان رکھو کہ خدا آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔
وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ (البقرہ - ۱۲)	اے محمدؐ! ہم نے تمہاری طرف کھلی کھلی آیتیں بھیجی ہیں اور ان کا انکار صرف وہی کرتے ہیں جو نافرمان ہیں۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (البقرہ - ۱۲۱)

اور جو اس کا انکار کریں وہی نامراد ہونگے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ .... وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ (العنکبوت - ۵)

اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی ...... اور ہماری آیتوں کو ماننے سے صرف کافر ہی انکار کرتے ہیں۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (النور - ۹)

پس خوف کریں وہ لوگ جو رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، کہ کہیں وہ کسی فتنے میں پڑجائیں، یا کہیں کوئی سخت عذاب انکو نہ آلے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ (محمد - ۱)

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اس ہدایت کو مان لیا جو محمدؐ پر اتاری گئی ہے کہ وہی انکے پروردگار کی طرف سے حق ہے، انکے گناہ خدا نے معاف کردیے اور انکا حال درست کردیا۔ یہ اسلیے کہ جنہوں نے کفر کیا انہوں نے باطل کا اتباع کیا۔ اور جو ایمان لائے انہوں نے اس حق کا اتباع کیا جو انکے پروردگار کی طرف سے ہے۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ

اللہ نے تمہاری طرف پیغمبر کو تمہاری آگاہی کیلیے بھیجا ہے۔ وہ تم کو اللہ کی کھلی کھلی آیات سناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکی سے

اِلَى النُّوْرِ (الطلاق - ۲) — نکال کر روشنی میں لائے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ...... فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران - ۴) — اے محمدؐ! کہدو کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تم سے محبت کریگا ...... اور اگر وہ اس سے باز رہیں تو بے شک اللہ کافروں سے تو محبت نہیں کرتا۔

یہ زور جو مذکورۂ بالا آیات میں نظر آتا ہے، یہ صرف اُسی کلام میں ہو سکتا ہے جسکے قائل کو اپنے صادق اور حق ہونے کا پورا پورا علم ہو، اور جو اپنے علم کے مطابق نوعِ انسانی کی اصلاح کا محکم ارادہ رکھتا ہو۔ ایسے کلام کی قدر وہ کمزور اخلاقی طاقت رکھنے والے لوگ کیسے کرسکتے ہیں جو صداقت کا علم الیقین بھی نہ رکھتے ہوں، اور پھر دنیا میں ہر ایک کو خوش بھی رکھنے کے متمنی ہوں۔ وہ تو بڑی سے بڑی بات جو کہہ سکتے ہیں وہ یہی ہوگی کہ بھائیو! سب اچھے اور سب سچے!

"سچ کے بجائے "صدق"

یکم مئی ۱۹۳۵ء سے ۲۲×۱۷/۴ ۲۰ پونڈ سفید چکنے کاغذ پر ہر مہینہ کی یکم۔ گیارہ اور اکیس ۲۱ کو شائع ہوتا ہے ہم کو معلوم ہے کہ صاحب ذوق حضرات جو مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کے طرزِ انشاء کے عاشق ہیں اور آپکے مخصوص دلنشین طرزِ صحافت کیلیے آپکے اخبار سچ کے بند ہونیکے بعد سے بیتاب تھے۔ اس مژدہ کو صحیح معنوں میں مژدہ سمجھینگے۔ لہذا شائقین حضرات اپنا اپنا چندہ قیمتی للعہ روپیہ جلد روانہ فرماکر خریداران کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرالیں ورنہ بعد کو پچھلے پرچہ دستیاب نہ ہونے پر پچھتانا پڑیگا

"صدق" ہر اعتبار سے سچ سے بڑھا ہوا ہے، معنوی حیثیت سے مضامین قرآنی کا اضافہ۔

سالانہ چندہ (للعہ) ترسیل زر بنام منیجر اخبار "صدق" نمبر ۴۳ ہیوٹ روڈ۔ لکھنؤ

رسائل و مسائل

دیہات میں نماز جمعہ اور مسلکِ حنفی

ذی الحجہ کے پرچے میں سلسلۂ اشارات علمائے کرام کو دو مسائل کیطرف لبطور خاص توجہ دلائی گئی تھی، یعنی خطبۂ جمعہ کی زبان، اور دیہات میں اقامت جمعہ۔ ان میں سے دوسرے مسئلے کے متعلق میرے پاس دو بزرگوں کی تحریریں آئی ہیں جو بجنسہٖ درج ذیل ہیں:

(۱) ”جمعہ فی القریٰ کے متعلق صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اصل مسئلہ میں تو کافی گنجائش ہے۔ آخر سوائے حنفیہ کے دوسرے حضرات کا مسلک ہی ہے۔ لیکن حنفیہ کے مذہب کی یہ تعبیر سمجھ میں نہیں آئی۔ اہل قریٰ پر جمعہ کی عدم فرضیت ان کا کھلا ہوا مسلک ہے۔ اس کے متعلق اگر کوئی خاص تحقیق ہو تو بشرط فرصت مطلع فرمائیں۔“

(۲) ”جمعہ اور اسکے خطبات اور دیہات میں جمعہ فرض ہونے کا جو فتویٰ دیا ہے وہ ہماری سمجھ سے بالا تر ہے، اور ہماری سمجھ میں مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب پر منطبق نہیں، کیونکہ ہر مذہب میں جمعہ کیلیے کچھ کچھ شرائط ہیں۔ موجودہ غیر مقلدین کی رائے البتہ وہی ہے جو مدیر ترجمان القرآن نے اختیار کی ہے۔“

اس باب میں کچھ عرض کرنے سے پہلے ایک بات صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں میری حیثیت ایک معاند کی نہیں ہے جو دلائل شرعیہ سے بے پروا ہو کر محض اپنی رائے سے امور دینی میں ایک مسلک اختیار کر لیتا ہو، اور اہلِ علم کی حجتوں کا جواب مکابرہ سے دیتا ہو۔ بلکہ میں ایک طالب علم ہوں۔ اپنی حد استطاعت تک مسائل کی تحقیق کرنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچتا ہوں اسکا اظہار بے کم وکاست کر دیتا ہوں۔ اور اگر میری رائے کے خلاف حجت قائم ہو جائے تو اس سے رجوع کیلیے بھی ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ جمعہ فی القریٰ کا مسئلہ چھیڑنے سے میرا مقصد کسی نئے فتنے کا دروازہ کھولنا نہیں ہے۔ دراصل حالاتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے میں محسوس کر رہا ہوں کہ اسوقت اس مسئلے کی چھان بین کر کے صحیح حکم شرعی معلوم کرنیکی سخت ضرورت ہے، اسلیے میں نے علمائے کرام کو اسکی طرف توجہ دلائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جن بزرگوں کو اللہ نے علم شریعت دیا ہے وہ بھی مسئلے کی اہمیت کو محسوس فرمائیں اور اپنی تحقیق سے مجھے اور عام مسلمانوں کو استفادہ کا موقع دیں۔ البتہ چونکہ مسئلے کو چھیڑنے کا باعث میں خود ہوں، اسلیے اپنی تحقیق کو واضح طور پر بیان کرنا مجھ پر لازم ہے۔

جمعہ فی القریٰ کے مسئلے پر اس سے پہلے ترجمان القرآن میں مفصل بحث کی جا چکی ہے جو محرم ۱۳۵۶ھ کی اشاعت میں درج ہوئی تھی۔ مگر اسوقت بحث کی بنا زیادہ تر آثار و سنن اور قیاس شرعی پر تھی، اس بنا پر غالباً بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا کہ میں مسلک حنفی سے منحرف ہو کر خود ایک مجتہدانہ (جسے عرفِ عام میں غیر مقلدانہ کہا جاتا ہے) رائے ظاہر کر رہا ہوں لہذا اب میں چاہتا ہوں کہ صرف مسلک حنفی کے مطابق اپنے دلائل بیان کروں۔

ہمارے سامنے چار امور تنقیح طلب ہیں، جنکے تصفیہ پر اس مسئلے کے تصفیہ کا مدار ہے:

(۱) جمعہ کی فرضیت کیسی ہے ؟
(۲) جمعہ کی شرائط کیا ہیں اور کس نوعیت کی ہیں ؟
(۳) کیا ان شرائط میں کبھی ترمیم ہوئی ہے ، اور کسی مزید ترمیم کی گنجائش بھی ہے ؟
(۴) اور کیا یہ جائز ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے کے لیے ایک ایسا نظام اختیار کیا جاسکے جو فقہائے حنفیہ کے فتاوی سے چاہے مختلف ہو، مگر انکے اصول کے خلاف نہ ہو؟

میں ان چاروں تنقیحات پر ترتیب وار بحث کرونگا۔

فرضیت جمعہ تمام علمائے امت کا اس امر پر اجماع ہے کہ جمعہ فرضِ عین ہے ۔ فقہائے حنفیہ بھی اس اجماع میں شریک ہیں ۔ چنانچہ علامہ سرخسی اپنی کتاب المبسوط میں لکھتے ہیں :

"جمعہ از روئے کتاب وسنت فرض ہے ..... اور اس کی فرضیت پر امت کا اجماع ہے"۔ (ج ۲ ص ۲۲)

علامہ ابنِ ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں :-

"جمعہ ایک ایسا فرض ہے جسکو محکم کرنے والی چیز کتاب اور سنت اور منکر کے کفر پر امت کا اجماع ہے"۔ (ج ۱ - ص ۴۰۷)

پھر نہایت تفصیل کے ساتھ دلائل فرضیت بیان کرنیکے بعد لکھتے ہیں :

"ہم نے فرضیت کے باب میں ایک طرح کے طول کلام سے اسلیے کام لیا کہ بعض جاہلوں کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ وہ جمعہ کی عدم فرضیت کا خیال مذہب حنفی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان کو یہ غلط فہمی دراصل قدوری کے اس قول سے ہوئی جس پر ہم آگے چل کر بحث کرینگے ، کہ "جس نے جمعہ کے روز بغیر کسی عذر کے گھر ہی پر ظہر کی نماز پڑھ لی اسکی نماز تو ہو گئی مگر

ایسا کرنا مکروہ ہے" اس قول میں مکروہ سے مراد دراصل حرام ہے، اور نماز ظہر کے صحیح ہو جانے کا جو مطلب ہے، وہ ہم آگے بیان کرینگے۔ بہرحال ہمارے اصحاب (حنفیہ) نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ جمعہ کی فرضیت، ظہر کی فرضیت سے بھی زیادہ سخت ہے، اور یہ کہ جمعہ کا منکر کافر ہے" (صفحہ ۴۰۹)

علامہ بابرتی شرح العنایہ علی الہدایہ میں لکھتے ہیں:

"ہم کو اقامت جمعہ کی خاطر نماز ظہر چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ظہر لا محالہ فرض ہے، اور فرض صرف اسی چیز کے لیے چھوڑا جا سکتا ہے جو اس سے زیادہ فرض ہو" جلد اول - صفحہ ۴۰۹

ان اقوال سے معلوم ہوا کہ نماز جمعہ استنباطی اور اجتہادی واجبات میں سے نہیں ہے بلکہ یہ نص صریح سے ثابت ہے جس نے اسکو مسلمانوں پر فرض کیا ہے، اور اسکی فرضیت اس نوع کی ہے کہ اس (یعنی اسکی فرضیت سے) انکار انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ ایسے فرض کو مسلمانوں پر سے ساقط کرنے میں سخت احتیاط اور خشیت کی ضرورت ہے۔ اول تو فرض منصوص کو صرف نص ہی ساقط کر سکتی ہے۔ کسی بڑے سے بڑے آدمی کا قول بھی اتنا وزن نہیں رکھتا کہ اسکی بنا پر خدا اور رسول کے مقرر کیے ہوئے فرض کو ساقط کیا جا سکے۔ دوسرے اگر کسی امام یا فقیہہ کے کسی قول سے اسقاط فرض کا پہلو نکلتا ہو تو نہایت احتیاط کے ساتھ یہ تحقیق کرنا چاہیے کہ اس کا مدعا حقیقت میں ہے کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جن حالات اور جن وجوہ سے اس نے یہ پہلو اختیار کیا تھا وہ اپنی جگہ درست ہوں، اور ہم وجوہ و احوال سے صرف نظر کر کے مجرد اسکے الفاظ کی پیروی کرنے میں غلطی — اسقاطِ فرض بلکہ انکار فرضیت کی سی خطرناک غلطی — کر رہے ہوں۔ تیسرے کسی فرض کو کسی حال یا مقام پر غیر فرض قرار دینے میں جتنی

احتیاط کی ضرورت ہے، اُس سے بدرجہا زیادہ احتیاط کی ضرورت اُسے ممنوع اور حرام اور گناہ قرار دینے میں برتنی چاہیے۔ فرض منصوص اور حرمت و معصیت کے درمیان بہت بڑی مسافت ہے۔ اس مسافت کو قطع کرنے کے لیے بڑی محکم سواری کی ضرورت ہے، کمزور سواریوں کے بل پر جو شخص اس راہ میں اترے گا اس کا انجام ظاہر ہے۔

شرائط جمعہ اب دیکھنا چاہیے کہ جمعے کی وہ شرائط جن کے فقدان سے فرض کے سقوط کا حکم لگایا جا سکتا ہے، کون کون سی ہیں، اور ان کی کیا نوعیت ہے۔

جمعہ کی شرائط دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو مصلّی کی ذات میں پائی جانی چاہییں دوسری وہ جو خارج میں متحقق ہونی چاہییں۔

پہلی قسم کی شرائط یہ ہیں کہ مصلّی مقیم ہو، مسافر نہ ہو۔ آزاد ہو، مملوک نہ ہو۔ مرد بالغ ہو، بچہ یا عورت نہ ہو۔ صحیح و تندرست ہو بیمار یا معذور نہ ہو (المبسوط جلد دوم صفحہ ۲۲)

ان شرائط کا ماخذ علمائے حنفیہ نے ذیل کی حدیث کو قرار دیا ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص
من کان یومن باللہ والیوم الاخر	اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو اس پر جمعہ فرض
فعلیہ الجمعۃ الا مسافر ومملوک	ہے۔ مگر مسافر، غلام، بچہ، عورت اور مریض
وصبی وامرأۃ ومریض۔	اس سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ رعایت جو مسافروں، غلاموں، عورتوں اور مریضوں کے ساتھ کی گئی ہے اس کے معنی صرف یہی ہیں کہ اگر یہ جمعہ میں شریک نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کسی شخص نے بھی اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا کہ ان کے لیے نماز جمعہ ممنوع ہے۔ نہ کسی نے یہ کہا کہ اگر وہ شریک جمعہ ہوں تو ترک ظہر کی وجہ سے گناہ گار ہونگے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتیں جمعہ کیلیے

حاضر ہوتی تھیں۔ غلام بھی شریک ہوتے تھے۔ اندھوں کو بھی اگر کوئی ہاتھ پکڑ کر پہنچا دینے والا مل جاتا تو وہ گھر نہ بیٹھے رہتے تھے۔ ان میں سے کسی شخص سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ تم پر سے جمعہ کا فرض ساقط ہے، تم کو جمعہ کے بجا ظہر پڑھنی چاہیے، ورنہ ترک ظہر کی وجہ سے گناہ گار ہوگے۔ علامہ سرخسی لکھتے ہیں:-

"یہ وجوب کی شرائط ہیں نہ کہ ادا کی شرائط۔ اگر مسافر اور غلام اور عورت اور مریض نماز جمعہ میں شریک ہو جائیں تو جائز ہوگا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، کہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ جمعہ پڑھتی تھیں اور ان سے کہا جاتا تھا کہ خوشبو لگا کر نہ آیا کرو۔" ان لوگوں سے فرض کے سقوط کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس نماز میں کوئی ایسی بات ہے جو ان کی شرکت سے مانع ہو۔ بلکہ صرف ان کو تکلیف سے بچانے کیلیے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اگر یہ اس تکلیف کو برداشت کرلیں تو پھر ادائے نماز میں یہ بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ مساوی ہونگے۔" (ج ۲ - صـ۲۳)

دوسری قسم کی شرائط کو شرائط ادا قرار دیا گیا ہے، یعنی اگر یہ نہ ہوں تو جمعہ ادا ہی نہ ہوگا۔ یہ چھ شرطیں ہیں۔ مصر، وقت، خطبہ، جماعت، سلطان، اذنِ عام۔ ان میں سے پہلی شرط یعنی مصر کی شرط ہی یہاں زیر بحث ہے، لیکن اس پر کلام کرنے سے پہلے یہ تحقیق کرنا ضروری ہے کہ ان شرائط کی نوعیت کیا ہے۔

ان میں سے بعض شرائط ایسی ہیں جو نصوص قولی و عملی سے صریحاً ثابت ہیں، مثلاً وقت کہ اس کا وقت ظہر ہونا ثابت ہے۔ اسی طرح خطبہ بھی صریحاً شرط جمعہ ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خطبہ کے بغیر جمعہ نہیں پڑھا اور قرآن میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے

اسی طرح جماعت کا بھی شرائط جمعہ میں سے ہونا ثابت ہے، اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں، اختلاف جو کچھ بھی ہوا ہے، مقدار جماعت میں ہوا ہے۔ اذن عام بھی رسول اکرم اور صحابہ اور ائمہ کے متواتر عمل سے ثابت ہے اور اہم مصالح شرعیہ اسکی مقتضی ہیں۔

بخلاف اسکے مصر اور سلطان کی شرائط ایسی ہیں جن کا ماخذ کوئی نص صریح نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر ان کا مدار استنباط و اجتہاد پر ہے، اور اسی لیے ان کا شرط ہونا بھی مختلف فیہ ہے۔ سلطان کی شرط کا ماخذ یہ حدیث ہے:

......فمن ترکہا تہاوناً واستخفافاً	...... پس جس نے جمعہ کو ایک معمولی چیز
بحقہا وله امام جائر او عادل فلا	سمجھ کر اور اس کے حق کو ہلکا جان کر چھوڑ دیا۔
جمع الله شمله الا فلا صلاة له الا	درانحالیکہ اس کا کوئی ظالم یا عادل امام ہو تو
فلا صوم له الا ان يتوب فان	خدا اسکی پراگندگی کو دور نہ کریگا، جان رکھو کہ نہ اسکی
تاب تاب الله عليه	نماز درست نہ اس کا روزہ درست ہے جب تک

کہ وہ توبہ نہ کرے۔ اگر توبہ کریگا تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیگا۔

نیز حضرت حسنؒ بصری کا یہ قول، جسکو ابن ابی شیبہؒ نے نقل کیا ہے:

اربع الی السلطان منها	چار چیزیں سلطان سے متعلق ہیں جن
اقامة الجمعة والعيدين	میں سے اقامت جمعہ و عیدین بھی ہے۔

لیکن یہ حدیث اور یہ اثر دونوں اس باب میں ناطق نہیں ہیں کہ امام یا سلطان کے بغیر اقامت جمعہ جائز ہی نہیں۔ حدیث سے تو صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں اسلامی نظام جماعت قائم ہو وہاں جمعہ کو ترک کرنا اور بھی زیادہ شدید گناہ ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ جس نے مسجد میں چوری کی اس پر خدا کی لعنت۔ اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس شخص کے

نزدیک چوری کا حرام ہونا اس شرط کیساتھ مشروط ہے کہ اس کا ارتکاب مسجد میں ہو، بلکہ دراصل وہ ارتکاب فی المسجد کو ایک مزید وجہ شناعت کی حیثیت سے بیان کر رہا ہے - بالکل اسی طرح حضور نے بھی امام مسلمین کی موجودگی، یا بالفاظ دیگر اسلامی نظام جماعت کی موجودگی کو ترک جمعہ کیلیے ایک اور سبب مردودیت کی حیثیت سے بیان فرمایا ہے - یہی وجہ ہے کہ دوسری احادیث جن میں فرضیت جمعہ کی تاکید آئی ہے، امام کے ذکر سے خالی ہیں، اور دوسری احادیث میں تارک جمعہ کو جتنی توبیخ کی گئی ہے، اس حدیث میں اس سے زیادہ توبیخ پائی جاتی ہے - اسی طرح وہ اثر بھی جو ابنِ ابی شیبہ نے نقل کیا ہے جمعہ کیلیے سلطان کے اشتراط پر دال نہیں ہے - اس میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ چار چیزوں کا اہتمام سلطان کو کرنا چاہیے جن میں سے ایک اقامت جمعہ وعیدین ہے - اس سے یہ مطلب کیونکر نکالا جا سکتا ہے کہ اگر سلطان نہ ہو تو یہ کام بند رہیں - اگر کوئی کہے کہ لڑکی کی شادی کرنا باپ کا کام ہے تو اس کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ باپ نہ ہو تو لڑکی بیٹھی رہے -

رہی مصر کی شرط تو اس کا ماخذ یہ حدیث ہے کہ :-

لا جمعۃ ولا تشریق الا فی مصر جامع	جمعہ اور عیدین مصر جامع کے سوا کہیں نہ پڑھی جائیں -

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اثر کہ :-

لا جمعۃ ولا تشریق ولا فطر ولا اضحیٰ الا فی مصر جامع	جمعہ اور تشریق اور عید فطر وعید اضحیٰ مصر جامع کے سوا کہیں نہ پڑھی جائیں -

لیکن مصر جامع کی کوئی تعریف کسی نص سے ماخوذ نہیں ہے - میں نے حتی الامکان پوری جستجو کی، مگر مجھے ابھی تک کسی حدیث یا کسی اثر سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ مصر کی حد کیا ہے - فقہائے حنفیہ کی کتابوں میں مصر کی جو تعریفات بیان ہوئی ہیں، (۶۹) ان میں سے کسی میں بھی کسی حدیث یا اثر کا حوالہ نہیں دیا گیا - [illegible]

۴۸۶

مطبوعات

پریم اور شانتی کا مذہب تالیف جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز بی - اے

جناب پرویز سے ناظرین ترجمان القرآن خوب واقف ہیں۔ انکے نام ہی سے لوگ خود اندازہ کر لینگے کہ یہ چھوٹا سا پمفلٹ کن خوبیوں کا حامل ہوگا۔ تاہم تبصرہ نگار کا فرض ہے کہ ہر چیز کا حسن و قبح سامنے لاکر رکھ دے۔

فاضل موٴلف نے اس رسالہ میں کوشش کی ہے کہ اسلام کا جو بھیانک تصور اغیار کے مکروہ اور بے اصل پروپیگنڈا نے غیر مسلم دماغوں میں پیدا کر دیا ہے اسے قرآن کی تعلیمات کے سیدھے سادے لفظوں میں پیش کر کے دور کر دیا جائے۔ اور بلاشبہ اس کام کو انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ وحی، ایمان، قرآن اور ختم نبوت کے مسائل کے ساتھ ساتھ بعض اسلامی احکام کو جس دلآویز، موٴثر، عام فہم، اور سلجھے ہوئے انداز بیان میں انہوں نے پیش کیا ہے وہ متعصب سے متعصب انسان کے دل میں بھی اسلام کی حقانیت کا نور کم سے کم ایک مرتبہ تو چمکا ہی دیگا۔

لیکن اس بات سے ہمیں سخت اختلاف ہے کہ دوسروں کیلیے اسلام کو مزین بنانے کی خاطر، ہم اُن تخیلات کو اسلام کی طرف منسوب کریں، جو اُن کو اپیل کرنے والے ہوں، اگر خود اسلام میں موجود نہ ہوں۔ اسلام کو پریم اور شانتی کا مذہب کہنا کسی طرح درست نہیں۔ "پریم" اور "شانتی"، یہ دونوں الفاظ ہندوؤں کے فلسفۂ اخلاق اور ان کے تصورِ روحانیت کی ترجمانی کرتے ہیں، جن پر اہنسا پرمو دھرما، اور نروان کے نصب العین کی

بنا قائم ہوتی ہے۔ ہندو فلسفی دنیا کی زندگی کو مایا کا جال سمجھتا ہے، اور اس مایا کے جال میں پھنستے ہی اُسے آواگون کے چکر میں پڑ جانیکا خوف ہوتا ہے، اسلیے وہ نظام اجتماعی کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے جی چراتا ہے، اور حیات دنیا سے منہ موڑ کر اپنے لیے عافیت اور سکون کا گوشہ تلاش کرتا ہے، تاکہ کائنات سے اس کا تعلق منقطع ہو، اور آواگون کے چکر سے نکل کر وہ نروان کے عدمی و سلبی عالم میں پہنچ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ عدل کے بجائے پریم اور مجاہدہ کے بجائے شانتی کے تصورات اسکے ذہن کو اپیل کرتے ہیں۔ منصب خلافت کے فرائض قبول نہ کرنیوالے کیلیے "پریم" اور ۔ رزمگاہ خیر و شر سے منہ موڑنے والے کے لیے "شانتی" کے سوا اور کونسی معراج تخیل ہو سکتی ہے؟ مگر اسلام سرے سے اس تصور حیات ہی کا مخالف ہے۔ اس کا تصور یہ ہے کہ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے، اور یہاں اسے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اپنے نفس کی طاقتوں اور کائنات کی ساری قوتوں سے خدا کی مرضی کے مطابق پورا پورا کام لے، اور اپنی سعی و کوشش سے دنیا کی زندگی کو ایسا کامیاب بنائے کہ وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے معیار کامیابی پر پوری اترے اور اس پر آخرت کی کامیابی کا نتیجہ مترتب ہو۔ اس نظام میں پریم اور شانتی بھی اپنی اپنی جگہ پر ہیں، مگر ان کو اوّلیت کا شرف حاصل نہیں ہے، بلکہ اوّلیت کا شرف صرف ایک چیز کو حاصل ہے، اور وہ یہ ہے کہ آفاق و انفس کی متصادم قوتوں کے درمیان قانون الٰہی کے مطابق عدل قائم کیا جائے، اور اس عدل کو قائم کرنے کیلیے منفرداً و مجتمعاً تمام اخلاقی و مادّی طاقتوں سے مجاہدہ کیا جائے۔ لہٰذا اسلام کو اگر کسی چیز کا مذہب کہا جاسکتا ہے تو وہ پریم اور شانتی نہیں بلکہ عدل اور جہاد فی سبیل اللہ ہے

اسکے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جس سے ہمیں اختلاف ہے، اور اس میں ہمارے دوست پرویز صاحب ہی نہیں بلکہ اکثر وہ حضرات مبتلا ہو جاتے ہیں جنہیں غیر مسلموں کا دل موہنے کیلیے رواداری کے اظہار کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں نبی بھیجے تھے، ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ ایک مسلمان کو ہر قوم کے مذہبی پیشواؤں کی عزت کرنی چاہیے، اور خدا کے مہیمن کلام کا یہ ارشاد بھی ہمارے سامنے ہے کہ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ الآیۃ - لیکن ہمیں یہ اختیار کیسے حاصل ہو گیا کہ جس علم کی تفصیل سے خدا نے ہمیں بے بہرہ رکھا ہم اسکی راز کشائی کے درپے ہو جائیں، وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہونے کی جسارت کریں، اور چینیوں، بدھوں، ہندوؤں اور پارسیوں کو خوش کرنے کیلیے "جناب کنفیوشس"، "مہاتما بدھ"، "شری رام چندر جی"، "شری کرشن مہاراج" اور "زردشت" کو تعین کے ساتھ یہ کہیں کہ یہ سب کے سب خدا کے نبی تھے جنکا نام مِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ کی اوٹ میں چھپا ہوا ہے۔ صلح کل کی پالیسی ہمیں دل و جان سے عزیز، لیکن اس باب میں بھی علم کی جائز حدود سے گذر جانا ہمارے نزدیک درست نہیں۔ مظنونات علم یقین کا درجہ نہیں لے سکتے۔ علم یقین صرف اس حد تک لے جا کر ہمیں چھوڑ دیتا ہے کہ ہندوستان، ایران اور چین میں بھی خدا کے نبی ضرور آئے ہونگے۔ اسکے بعد یہ صرف گمان ہی گمان رہ جاتا ہے کہ شائد فلاں شخص نبی ہو۔ تعین کیساتھ یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ مثلاً ہندوستان میں شری رام چندر جی نبی ہو کر آئے تھے۔ ممکن ہے وہ محض ایک مصلح اور ریفارمر رہے ہوں یا صرف مجدد شریعت کی حیثیت رکھتے ...... ہوں۔ اور آج تو حال یہ ہے کہ تاریخی تنقید نے رام چندر جی کا وجود ہی مشکوک کر دیا ہے، چنانچہ خود ایک ہندو فاضل نے دعویٰ کیا ہے کہ رام اور

سیتا کے افسانے مصری اور فرعونی روایات قدیمہ سے ماخوذ ہیں۔

فرض کیجیے مرزا غلام احمد قادیانی کا خودساختہ علم نبوت بعثت نبوی سے بہت پہلے اٹھ چکا ہوتا اور آج ان کے متبعین کی تعداد بودھوں اور ہندوؤں کی طرح سطح ارض پر پھیلی ہوئی ہوتی تو کیا اس اصول کے ماتحت منھم من لم نقصص علیک کے ہاتھوں ان کو بھی خلعت نبوت سے سرفراز کر دیا جاتا! آخر ایسے ہی امکانات تو ہر ایک مدعی کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں لہذا ہمارے لیے مامون راہ یہی ہے کہ ہم ان تمام بانیانِ مذاہب کے بارے میں کامل سکوت اور توقف اختیار کریں۔ نہ انکی نبوت کا اقرار کریں نہ انکار۔ صرف اجمالی عقیدہ رکھیں کہ ہر قوم میں نبی آچکا ہے، لیکن اس کا نام کیا ہے؟ اس کے جواب میں ہم صاف طور پر اپنی لاعلمی کا اظہار کرینگے، اسلیے کہ علم الیقین کے بغیر کسی کو خدا کا نبی ٹھیرانا ہمارے لیے جائز نہیں۔

یہ رسالہ غیر مسلم حضرات کیلیے صرف تین پیسہ کا ٹکٹ بھیج کر ذیل کے پتہ سے مفت طلب کیا جاسکتا ہے۔ شیخ فضل الرحمن صاحب۔ ۴ ایل روڈ۔ گورنمنٹ کوارٹرز۔ نزد چوبرجی لاہور

طلوع اسلام | مرتبہ حکیم ذکی احمد خاں صاحب، ضخامت ۸۰ صفحات، شرح چندہ سالانہ ۵ روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ رسالہ طلوع اسلام۔ دہلی

یہ رسالہ پہلے جناب سید نذیر نیازی صاحب کی ادارت میں نکلا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے بند ہو گیا تھا۔ اب ازسرنو اسکی اشاعت شروع ہوئی ہے اور اس مرتبہ، ایک شخص کے بجائے اسکی زمامِ ادارت ایک مستقل بیدار مغز جماعت کے ہاتھ میں ہے جو پورے عزم اور خلوص کے ساتھ میدان میں آئی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد خود اسی کے الفاظ میں یہ ہیں :۔

"پیام اقبال کی نشر و اشاعت اس کا مقصد ہوگا" "یہ مجلہ ملت اسلامیہ کی ہیئت اجتماعیہ کا نقیب ہوگا اور اس کی ملی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کریگا"

اس دور میں جبکہ زندگی کے ہر شعبہ میں غیر اسلامی تصورات سرایت کر رہے ہیں اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بغیر سوچے سمجھے ان سے متاثر بلکہ مسحور ہو رہا ہے، امت مرحومہ کی اس سے بڑی اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی کہ اسلامی فکر و نظر کو زیادہ سے زیادہ اصلی رنگ میں پیش کیا جائے، تاکہ اوہام اور ظنون کی وادیوں میں بھٹکنے والے، اپنے اور غیر، سب کے سب ہر مشکل کا صحیح حل پا سکیں۔ رسالہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے۔ یہ اسکا پہلا نمبر ہے، جسکے مضامین نہایت مفید اور بلند پایہ ہیں۔ خصوصاً "دین فطرت"، "نظریۂ قومیت کتاب و سنت کی روشنی میں"، اور "کانگرس، لیگ اور مسلمان" کے عنوان سے جو سنجیدہ اور تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں۔ بہت خوب ہیں۔ آخر میں "رفتار زمانہ" کے تحت سیاسیات عالم پر ایک مجمل لیکن پر مغز تبصرہ ہے۔

طلوع اسلام کے دور اول کا بھی ہم نے صمیم قلب کے ساتھ خیر مقدم کیا تھا، اور اب دور ثانی کا بھی اسی طرح خیر مقدم کرتے ہیں، بلکہ اس کی حیات نو ہمارے لیے پہلے سے بھی کچھ زیادہ موجب مسرت ہے، اس لیے کہ اب وہ ہم کو ایک ایسا رفیق سفر نظر آتا ہے جو ٹھیک اسی نصب العین کی طرف چل رہا ہے جسکی طرف ہم گامزن ہیں۔ جاہلیت جدیدہ کے مقابلہ میں فکر اسلامی کی تبلیغ کرنے والے آج اس قدر کمیاب ہیں کہ جب تاریکی میں سے کوئی مجاہد نمودار ہوتا ہے تو ہمیں اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی کسی کال کے مارے ہوئے کسان کو آسمان پر لکۂ ابر دیکھ کر ہوا کرتی ہے۔

سالنامہ پیام تعلیم | مرتبہ محمد حسین خاں صاحب ندوی جامعی، ضخامت ۱۲۸ صفحات، ملنے کا پتہ:۔ جامعہ ملیہ، قرول باغ - دہلی۔ پیام تعلیم کی عمر بیس سال کی ہو چکی ہے۔ اس عرصہ میں اس نے بچوں کی دماغی تربیت اور تعلیمی ترقی میں جو نمایاں اور مؤثر خدمات انجام

دی ہیں ہمیں اردو صحافت میں اسکی مثال نہیں ملتی، اسکی افادی حیثیت دن بدن بلند ہی ہوتی جارہی ہے۔ حسب معمول ۳۷ء کے اختتام پر بھی اس کا سالنامہ نکلا ہے جو ہر طرح کی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ زبان نہایت صاف اور شیریں۔ ادبیت بلند، مضامین بے حد دلچسپ اور مفید معلومات سے پُر ہیں۔ اس رسالہ کا کمال ہی یہ ہے کہ ہر بات کو اپنے دلچسپ اور نفسیاتی اصول کیساتھ کہتا ہے کہ غبی اور کور ذوق بچہ بھی اسے پڑھنے پر مجبور ہوجائے۔ یوں تو اس سالنامہ کا ہر مضمون اپنی جگہ پر کامیاب ہے لیکن "نیر" صاحب کی سلیس نظمیں اور "جگ بیتی" "شیخ نیازی" "ہوٹل کا ریڈیو" اس پرچے کی جان ہیں۔ اسکے ساتھ فاضل مدیر سے اتنی گذارش بھی ہے کہ بچوں کے دلوں میں ابھی سے اشتراکیت کا بیج بونے کی کوشش نہ فرمائیں۔ آگے چل کر یہ بچے خود آزاد مطالعہ جو مشرب چاہینگے، اختیار کرلینگے۔

قرآن پاک کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا	تالیف مولوی عبدالواحد صاحب سندھی استاذ جامعہ ملیہ۔ ضخامت ۱۰۴ صفحات، قیمت ۶؍ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ۔ قرولباغ دہلی۔

یہ رسالہ بچوں کیلئے لکھا گیا ہے جس میں اسلام اور قرآن کی تعریف، انکی اجمالی تاریخ قرآن کی کتابت اور حفاظت، کلام الٰہی کے اثر و اعجاز اور اسکی موٹی موٹی تعلیمات کو بچوں کے مناسب نہایت سہل زبان اور دلنشیں پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اسے پڑھکر بچوں کے دل میں قرآن کی عظمت اور رسولؐ کی صداقت کا گہرا نقش بیٹھ سکتا ہے۔ رسالہ کے آخر میں "ایک باپ کی اپنے بیٹے کو نصیحتیں" کے عنوان سے سورۂ لقمان کے اس حصہ کا با محاورہ ترجمہ دیدیا گیا ہے جسمیں حضرت لقمان کی حکیمانہ وصیتیں منقول ہیں۔ اگر ترجمہ کے بجائے نفسِ مضمون کو لیکر اپنے لفظوں میں ادا کردیا جاتا تو بچوں کیلئے زیادہ مفید ہوتا۔ ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر "بانی اسلام" کے لفظ سے کیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح

اہل مغرب کی ایجاد ہے جو اپنے اندر ایک خاص معنویت رکھتی ہے ، اور براہ راست صداقت رسولؐ سے ٹکراتی ہے مسلمانوں کو اس کے استعمال سے احتراز کرنا چاہیے خصوصاً بچوں کے باب میں۔

بچوں کیلیے جامعہ ملیہ کی کتابیں (۱) دنیا کے بچے۔ قیمت ۶ ر (۲) چھدّو۔ قیمت ۳ ر (۳) شیدلا۔ قیمت ۳ ر (۴) چھوٹا چھتو۔ قیمت ۲ ر (۵) کائنات۔ قیمت پانچ آنے (۶) نیت کا پھل۔ قیمت ۲ ر (۷) شہزادی گلنار۔ قیمت ۴ ر (۸) انعامی مقابلہ قیمت ۳ ر (۹) جنگو کی بلّی۔ قیمت ۲ ر (۱۰) پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی۔ قیمت ۲ ر (۱۱) لطائف غالب قیمت ۳ ر

یہ سب کتابیں بچوں کیلیے مفید ہیں۔ ان میں سے اکثر میں چھوٹی چھوٹی سبق آموز اور دلچسپ کہانیاں ہیں۔ اور بعض کتابوں میں بچوں کی معلومات اور ان کے دائرۂ نظر کو وسیع کرنے کیلیے بہت اچھا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ خصوصاً "کائنات" بہت قابلِ قدر چیز ہے "دنیا" کے بچے بھی عمدہ کتاب ہے۔ بعض کہانیوں میں بجز زبان کے اور کچھ نہیں ہے، بلکہ ان سے بچوں میں اعجوبہ پرستی اور وہمیت پیدا ہونیکا اندیشہ ہے۔ مثلاً "چھدّو"۔ اور "باچھو" اور "پان کو" کی کہانیاں، اور "جنگو کی بلی"، کہ اس قسم کے قصے بچوں میں غیر فطری امور سے دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔

قلعہ معلّٰی کی جھلکیاں تالیف جناب عرش تیموری۔ ضخامت ۷۲ صفحات، قیمت ۸ ر ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جہاں نما اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

اس کتاب میں دلّی کی اسلامی سلطنت کے مٹتے ہوئے آخری نقوش کا ایک غیر مترتب اور دھندلا سا مرقع پیش کیا گیا ہے، جس میں ۵۷ء کے پر آشوب زمانہ اور اسکے کچھ پیشتر و مابعد کے وہ عبرت انگیز واقعات درج ہیں جنھیں مولف نے قلعہ معلی کی

جھلکیوں سے تعبیر کیا ہے۔ مولف موصوف خود اسی اجڑے ہوئے چمن کی حرماں نصیب یادگاروں میں سے ہیں۔ انھوں نے خاندانی روایتوں کی مدد سے متفرق واقعات کو جمع کر دیا ہے جنکے اندر کوئی تاریخی ترتیب ملحوظ نہیں، لیکن پڑھنے والوں کیلیے وجہ عبرت اور سرمایہ حسرت ضرور ہیں اور شاید جامع کا مقصد بھی اسی قدر ہے۔ خاندان شاہی کی پریشانیوں اور مظلومیوں کی داستان کے علاوہ اس دور کے شاہی انتظام سلطنت، تمدن و معاشرت، رسم و رواج، افراد خاندان کی طرز بود و ماند اور ان کی ذہنی و اخلاقی حالت کا ایک اجمالی خاکہ بھی اس میں ملتا ہے جس سے ایک مورخ بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں تالیف مولوی ابوالحسنات صاحب ندوی مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین۔ ضخامت ۴ ۱۴ صفحات قیمت ۱۲ ار ملنے کا پتہ منیجر دارالمصنفین۔ اعظم گڈھ

یہ کتاب رسالہ معارف کے ایک سلسلہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مصنف مرحوم نے اس میں بڑی کاوش سے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے اس پہلو کو روشن کیا ہے جسکے متعلق موجودہ متداول تاریخوں میں ہمیں اجمالی اشارات بھی بمشکل ہی ملتے ہیں۔ ہماری تاریخوں کے مصنفین جب محمود غزنوی کا تذکرہ کرینگے تو انکا قلم نہایت آب و تاب کیساتھ سترہ خونی مرقع کھینچکر خاموش ہو جائیگا۔ یہ بتانا اسکے فرائض میں سے ہرگز نہ ہو گا کہ اس علم پرور حکمراں نے ہندوستان کی جہالت پر کتنے حملے کیے تھے۔ مصنف مرحوم لائق شکریہ ہیں کہ انھوں نے قوم کے اس فرض کفایہ کو ادا کیا اور تاریخ کے قدیم انباروں، سلاطین کے فرمانوں، کتبوں اور اثری تحقیقات کے عسیر الحصول ذخیروں سے چن کر یہ نادر اور خوشنما مجموعہ ہمارے سامنے پیش کیا۔

مصنف نے آغاز سے لیکر زوال حکومت تک مسلمان حکمرانوں اور امیروں کے

قائم کئے ہوئے مدرسوں کی تاریخی تفصیلات جس قدر بھی انھیں میسر آسکیں اکٹھی کردی ہیں اور ہر ایک صوبہ کو لیکر الگ الگ باب قائم کرکے اسکی تعلیمگاہوں کا تذکرہ مدلل طریقہ سے کیا ہے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ان مستقل تعلیم گاہوں کے علاوہ اشاعت علم کے دوسرے ذرائع کیا تھے۔ شخصی طور پر تعلیم کا کیسا رواج تھا، تعلیم کیلئے شیراز و بغداد سے اساتذۂ فن کس گرمجوشی سے آیا کرتے تھے۔ اس کے بعد قدیم طریقہ تعلیم اور مختلف دوروں کے عربی نصاب تعلیم کی تفصیل دی ہے اور آخر میں موجودہ نصاب کے نقائص پر مفید نقد کیا ہے۔

عربی کے بعد فارسی طرز تعلیم، نصاب تعلیم اور اس کی اشاعت کے اسباب سے بحث کی ہے جسکے بعض ذیلی مباحث عنوان کتاب کے لحاظ سے کسی قدر غیر مناسب طول اختیار کرگئے ہیں مثلاً فارسی زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کے نتائج کے سلسلۂ بیان میں ہندو مسلم شعرائے فارسی کے تذکرے اور ان کے کلام پر تبصرے اصل عنوان سے کچھ زیادہ موزونیت نہیں رکھتے۔

مصنف نے ان معلومات کے حاصل کرنے میں بڑی ہی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ چھ سات سو برس کی مسلسل حکمرانی میں مسلمانوں نے صرف اتنے ہی مدارس قائم کیے۔ دراصل یہ تو اس دریا کا ایک قطرہ ہے، جسکی پہنائی ہماری نگاہ تصور سے کہیں زیادہ ہے۔ اب ہمارے دیگر ارباب علم کا فرض ہے کہ وہ اس عمارت کو مکمل کریں جسکی بنا فاضل مصنف نے رکھی ہے۔

مجاہد ہند | تالیف محمد اسحٰق حنیف صاحب امرتسری۔ ضخامت ۳۲ صفحات قیمت ۲/

یہ رسالہ حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا گیا ہے۔ اس میں اختصار کے ساتھ آپ کے تبلیغی کارناموں اور مجاہدانہ غزوات کا ذکر ہے۔ رسالہ ضرورت سے

زیادہ مختصر ہے۔ زبان بہت اصلاح طلب ہے۔ مثلاً ''جنگ'' کا لفظ اردو میں مونث استعمال ہوتا ہے لیکن رسالہ مذکور میں جگہ جگہ مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ ''سینہ بسینہ لڑائی'' محاورہ نہیں ہے بلکہ ''دست بدست'' ہے۔ اسیطرح ''باغی ہو گیا ہوا تھا'' اور ''سکھوں نے قید کیا ہوا تھا'' خالص پنجابی محاورے ہیں۔ فصحائے ادب نے اسے ابھی سند قبولیت نہیں دی ہے۔

آجکل افسردہ دل اور افسردہ ایمان مسلمانوں کو ایسے رسائل کا خاص طور سے مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ انھیں معلوم ہو کہ اسلام کیا چیز ہے اور ایمان میں کتنی قوت ہے۔

(۱) مرآۃ الرسوم	تالیفات ابو القاسم غلام رسول صاحب بی۔ اے سکریٹری دی افغان یونین
(۲) ترغیب الصلوٰۃ	ملنے کا پتہ: سکریٹری دی افغان یونین، جھونا کمہار واڑہ۔ کراچی۔
(۳) امانت اور عہد	افغان یونین ایک اصلاحی انجمن ہے جو عام مسلمانوں کی مذہبی اور
(۴) ابو ہریرہؓ	معاشرتی حالت سدھارنے اور انھیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرنے

کیلیے قائم ہوئی ہے۔ انجمن نے یہ رسالے اپنی اغراض کیلیے شائع کیے ہیں۔ پہلے رسالہ میں شادی و غمی، مذہبی تہواروں اور عام معاشرتی و مذہبی معاملات میں جو لغو رسوم اور بدعات رواج پا گئی ہیں انکی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے اور لوگوں کو اسلام کی اصلی باتیں بتائی گئی ہیں۔ دوسرے اور تیسرے رسالہ میں امانت اور وفائے عہد اور نماز کی اہمیت کو کتاب و سنت کے حوالوں سے جتا کر لوگوں کو بیدار کیا گیا ہے۔ چوتھے میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہوئی چالیس حدیثیں مع ترجمہ درج ہیں بعض حدیثوں کے ضمن میں تشریحی نوٹ بھی ہیں۔ ترجمہ سلیس اور عام فہم ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کے مختصر حالات بھی دیے گئے ہیں۔ شروع کتاب میں شمائل نبوی پر ایک ایمان افروز مقالہ بھی ہے۔

مطبوعات جامعۂ عثمانیہ

حیدرآباد دکن

سررشتہ تالیف و ترجمہ کے زیر اہتمام قدیم و جدید علوم و فنون

میں تقریباً ڈھائی سو (۲۵۰) اردو کتابیں بشکل تالیفات و تراجم شائع ہو چکی

ہیں۔ انکے سوا ابھی کتابیں تیار ہو رہی ہیں۔

فہرست مطبوعات فرمائش پر ارسال ہوتی ہے۔

محمد الیاس برنی

ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ

حیدرآباد۔ دکن

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

اس کتاب میں ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین یکجا جمع کر کے شائع کیے گئے ہیں جو ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ١٣٥٦ھ سے رجب ١٣٥٦ھ تک لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت، اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ تبصرہ ہے، جس سے مسلمانان ہند کے دل و دماغ میں ان کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رہی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں۔

ایک روپے میں	٥ نسخے	علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں	٥٠ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں	١٠٠ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار

نوٹ: محصول ڈاک فی نسخہ سات پیسے ہے۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ٢٥ نسخے منگوانے میں فائدہ رہتا ہے۔

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت ۔ اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ ۔ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ ۔ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار ۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے ۔

۵- قوانین جنگ ۔ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات ۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں ۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید ۔ بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ ۔ قیمت مجلد صہ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات

یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلیے لکھا گیا ہے ۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے ۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے ۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانہ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں ۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے ۔

قیمت ۱۰؍ محصولڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سوہل و صادر پرنٹ پریس لاہور میں طبع ہوئے